اجراء حسبِ ارشاد: شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانوی قدس سرہ

مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

مدیر مسئول (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۵ | ذوالعقدہ ۱۴۴۵ھ | مئی ۲۰۲۴ء | شمارہ ۵

الجمعین بین النفعین

دو نعمتوں کا اجتماع (قسط اول)

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۵۰ روپے زرسالانہ =/ ۶۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

الجمعین بینُ النفعین

(دو نعمتوں کا اجتماع) قسط اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

یہ وعظ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ بعد جمعہ بمقام مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون حضرت والا نے ارشاد فرمایا، جس کو شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۴۰۰ تھی۔

دین کا ہر عمل مجاہدہ ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ دین تقلید ہے اور تقلید نفس کو گراں ہے ورنہ اعمال شرعیہ میں کوئی عمل فی نفسہٖ دشوار یا طاقت سے باہر نہیں، سب اعمال فی نفسہ آسان وسہل ہیں۔ اس زمانے میں طاعون پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے اموات بکثرت واقع ہورہی تھیں طاعون میں مبتلا ہوکر مرنے والا چونکہ شہید ہوتا ہے اس لیے ایک رمضان کی نعمت ایک شہادت کی نعمت دونوں حاصل ہوگئیں اور اگر شہادت نہ بھی ہوئی تو ایک مجاہدہ اضطراریہ، ایک مجاہدہ اختیاریہ دو نعمتیں حاصل ہوگئیں اس لیے اگر اس رمضان میں طاعون کی وجہ سے عمل زیادہ نہ ہوا جتنا پہلے رمضان میں معمول تھا تو ان شاء اللہ ثواب پورا ملے گا اس بنا پر یہ رمضان نعمتوں کا مجموعہ ہوگیا غالباً اسی مناسبت سے وعظ کا نام الجمعین بین النفعین رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

نوٹ: وعظ کی طوالت کے پیش نظر دو قسطوں میں طبع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

خلیل احمد تھانوی

25_3_24

فہرست

❀❀❀

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَٱلصَّٰبِرِينَ فِي ٱلۡبَأۡسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلۡبَأۡسِۗ أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُواْۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُتَّقُونَ (۱)

بیان کے قبل عرض کردینا ضروری ہے کہ مجھ کو بعض عذر ایسے ہیں جن کی وجہ سے نہ بلند آواز سے بیان کرسکتا ہوں نہ دیر تک بیان کرسکتا ہوں لیکن اگر سامعین توجہ سے سنیں اور باتیں نہ کریں تو ان شاء اللہ سب کو آواز پہنچ جائے اور بیان اگر تھوڑی دیر بھی ہوا تو امید ہے کہ ضرورت کے موافق کافی ہوگا۔ (۲)

ابتدائے بیان

اب میں بیان شروع کرتا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرائط کمال کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے اوپر لَّيۡسَ ٱلۡبِرَّ أَن تُوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ قِبَلَ ٱلۡمَشۡرِقِ وَٱلۡمَغۡرِبِ (۳) نیکی یہی نہیں کہ تم منہ کرو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف۔ غیر کمال کو کمال سمجھنے کی نفی تھی وَلَٰكِنَّ ٱلۡبِرَّ مَنۡ ءَامَنَ بِٱللَّهِ سے شرائط کا ذکر شروع ہوا ہے۔

---

(۱) ''اور صبر کرنے والے سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں'' سورۃ البقرہ: ۱۷۷ (۲) اسی آیت پر حضرت نے بارہ سال قبل بھی بیان فرمایا تھا جو ''الصبر'' کے نام سے طبع ہوا تھا (۳) سورۃ البقرہ: ۱۷۷۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس کو تم کمال سمجھے ہو وہ کمال کافی نہیں بلکہ کمال مقصود کی تحصیل کی یہ شرائط ہیں جو ہم بتلاتے ہیں۔ ان شرائط کی تحصیل میں سعی (۱) کرو تو کمال مقصود حاصل ہو جائے گا اور چونکہ یہاں شرائط کمال مذکور ہیں اس لئے یہ آیت تمام ابواب دین کو جامع ہے گو تفصیلاً نہیں مگر اجمالاً مہمات (۲) دین سب اس میں مذکور ہیں۔ چنانچہ **مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَٱلْمَلَـٰٓئِكَةِ وَٱلْكِتَـٰبِ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ** (۳) میں امہات (۴) عقائد مذکور ہیں۔ **وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ** (۵) میں عبادات مالیہ کا ذکر ہے۔ **وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ** میں عبادات بدنیہ کا بیان ہے اور چونکہ نماز عبادات بدنیہ میں سب سے اعلیٰ واہم ہے اور جملہ انواع عبادات کو جامع (۶) ہے اس لئے اسی کے ذکر پر اکتفاء فرمایا اور یہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ اس مقام پر امہات ابواب دین (۷) کو بیان کیا گیا ہے جزئیات کی تفصیل نہیں کی گئی کیونکہ اس کے لئے تو بڑا وقت چاہئے اس کے بعد **و اتی الزکوٰۃ** ظاہر میں مکرر معلوم ہوتا ہے کیونکہ **و اتی المال** میں عبادات مالیہ کا ذکر آ چکا ہے اور زکوٰۃ بھی عبادات مالیہ میں سے ہے مگر واقع میں یہاں تکرار نہیں اور یہ بات حدیث سے معلوم ہوئی اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم یوں کہتے کہ یہ جملہ مکرر ہے اور تکرار کی حکمت یہ بیان کر دیتے۔

بخل کی مذمت

لوگ عبادات مالیہ میں کوتاہی زیادہ کرتے ہیں کیونکہ عام طور سے بخل طبائع پر غالب ہے (۸) جان دینا اور بدن پر مشقت برداشت کر لینا تو ان کو آسان ہے مگر روپیہ اور مال خرچ کرنا دشوار ہے۔ جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں

(۱) کوشش کرو (۲) دین کی اہم باتیں (۳) ''نیکی یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان لے آئے اور یوم آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور نبیوں پر'' سورۃ البقرہ: ۱۷۷ (۴) بنیادی (۵) ''اور مال دے اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں، مسکینوں اور سوال کرنیوالوں اور قیدیوں کو قید سے چھڑانے کیلئے'' سورۃ البقرہ: ۱۷۷ (۶) عبادت کی تمام قسمیں (۷) دین کے اہم ابواب (۸) صفت بخل اکثر طبیعتوں میں پائی جاتی ہے۔

ایک کتا اس کے ساتھ تھا۔ راستہ میں بھوک کی وجہ سے وہ مرنے لگا تو بدوی رونے لگا۔ کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا۔ اب یہ مر رہا ہے اس لئے رو رہا ہوں۔ پوچھا اس کو مرض کیا ہے؟ کہا اس کا مرض جوع الکلب (۱) ہے یعنی بھوکا ہے۔ سائل کو بھی یہ سن کر رحم آیا۔ اس نے ایک طرف بڑا سا بورا رکھا ہوا دیکھا۔ پوچھا اس بورے میں کیا ہے۔ کہا اس میں سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے ہیں۔ اس نے کہا پھر تو دو چار ٹکڑے اس کتے کو کیوں نہیں دے دیتا جس سے تجھے اتنی محبت ہے کہ اس کے مرنے پر رو رہا ہے۔ کہا واہ صاحب واہ روٹی میں تو میرے دام (۲) لگے ہیں آنسوؤں میں کون سے دام لگے ہیں اس لیے مجھے رولینا آسان ہے روٹی نہیں دے سکتا۔ مولانا (۳) نے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

گفت ناید بے درم در راہ ناں لیک ہست آب دو دیدہ رائے گاں (۴)

خیر اس بدوی نے تو بخل کی حد ہی کر دی مگر یہ ضرور ہے کہ بخل عام طور پر طبائع پر غالب ہے اور اکثر آدمیوں کو روپیہ پیسہ ہاتھ سے نکالنا گراں ہوتا ہے۔ ہاں نماز یا قرآن جتنا چاہو پڑھوالو، اسی واسطے اکثر سود خور بخیل نمازی اور روزہ دار بہت دیکھے جاتے ہیں۔

تشریح قرآن میں حدیث کی احتیاج

اسخیاء (۵) کی حالت برعکس ہے ان سے مال تو جتنا چاہو لے لو اور جان میں ایسے بخیل ہیں اور مال میں سخی ہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ (زکوۃ ادا کرو) کو مکرر فرمایا مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تکرار نہیں بلکہ وَءَاتَى ٱلْمَالَ (مال دو) میں **ایتا** سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ چنانچہ اس حدیث کے یہ الفاظ ہیں ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ (۶) اور اس کے ساتھ آپ نے اس آیت کی تلاوت

(۱) کتے کو بھوک لگی ہوئی ہے اس سے مر رہا ہے (۲) پیسے (۳) مولانا روم نے مثنوی میں (۴) ''اس نے کہا کہ بغیر درم کے روٹی نہیں آتی لیکن دو آنسو مفت کے ہیں'' (۵) سخیوں کی حالت اس کے برخلاف ہے (۶) ''مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق ہیں'' سنن الترمذی: ۶۵۹۔

فرمائی اس کو ترمذی نے روایت کیا اس کے بعد زکوۃ کا ذکر فرمایا باقی زکوٰۃ کے مصارف اس لئے بیان نہیں کئے گئے کہ اتی الزکوۃ سن کر تم خود ہی پوچھو گے کہ زکوٰۃ کن لوگوں کو دیں۔ جب سوال کرو گے جواب دے دیا جائے گا۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے :إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱلۡعَٰمِلِينَ عَلَيۡهَا (الآیۃ)(۱) (زکوٰۃ فقراء ،مساکین اور عاملین (جو تحصیل زکوٰۃ کیلئے اسلامی حکومت سے مقرر ہوں) کا حق ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں پہلے بیان پر اکتفا کیا ہو جو اتی المال میں مذکور ہیں اور یہ بات ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد سے معلوم ہوئی کہ اوپر غیر زکوٰۃ کا ذکر ہے ہماری عقل وہاں تک نہ پہنچتی ہم تو اس کو تکرار ہی پر محمول کرتے ہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن اپنی شرح میں حدیث کا محتاج ہے کیونکہ قرآن خبر بھی ہے کیا چیز ہے؟

قرآن کلام شاہی ہے

قرآن کلام شاہی ہے۔حق تعالیٰ شانہ احکم الحاکمین کا کلام ہے۔اس کے سمجھنے کے لئے ہر اک کی عقل کافی نہیں۔ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

چیست قرآن ایں کلام حق شناس　　رونمائے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنی　　معنی در معنی در معنی(۲)

قرآن کے لئے ظہر وبطن (۳) ہے پھر بعض تو ایسے ہیں جن کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں،عوام نہیں سمجھ سکتے اور بعض بطون (۴) ایسے ہیں جن کو سب علماء بھی نہیں سمجھ سکتے بلکہ خاص خاص علماء ہی سمجھتے ہیں یعنی مجتہدین اور بعض کو مجتہدین بھی نہیں سمجھتے بلکہ انبیاء ہی سمجھتے ہیں اور وہ بھی وحی سے، پھر نہ معلوم فرقہ قرآنیہ حدیث سے کیونکر مستغنی (۵) ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے پھر حدیث کی کیا ضرورت ہے۔

(۱)سورۃ التوبہ:۶۰ (۲)''اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن کیا ہے یہ لوگوں کے لیے لوگوں کے رب کی رونمائی ہے اور اس کا حرف حرف سچ ہے اور معنی سے لبریز ہے اس کے معنوں کے اندر معنی مضمر ہیں'' (۳) آیات قرآنی کے ایک ظاہری معنی ہیں ایک باطنی معنی ہیں (۴) بعض باطنی معنی ایسے ہیں (۵) بے نیاز۔

قرآن فہمی کے لیے حدیث وفقہ کی ضرورت

یہ واقعی سچ ہے کہ قرآن میں ضروریات دین سب ہیں مگر گفتگو اس میں ہے کہ ہم ان سب کو سمجھ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں:

جميع العلم في القرآن لكن　　تقاصر عنه افهام الرجال(۱)

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقی شارع(۲) نہیں ہیں بلکہ آپ شارح(۳) ہیں یعنی قرآن کی شرح فرماتے ہیں۔ باقی شارع حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ حضور بذریعہ وحی کے مبلغ ہیں اور قرآن کی تفسیر بیان فرمانے والے ہیں۔ تو ہم کو قرآن پر عمل کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر کو حل کریں اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حل کرنے کے لئے فقہ حاصل کریں۔

حدیث وفقہ سمجھنے کا طریقہ

اور حدیث وفقہ کے حاصل کرنے کا بھی یہ طریقہ نہیں کہ خود مطالعہ کر لیا جائے بلکہ جس طرح صحابہؓ نے قرآن کو حضور سے پڑھ کر سمجھا اور تابعین نے صحابہ سے پڑھ کر حل کیا اسی طرح ہر زمانہ میں جو علماء ہوں ان سے سبقاً سبقاً پڑھ کر قرآن وحدیث وفقہ کو حل کرنا چاہئے، محض اپنے مطالعہ سے اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ وہ اجتہاد نہ ہوگا بلکہ ایجاد ہوگا۔ شاید کوئی کہے کہ اب تو قرآن وحدیث کے تراجم شائع ہو گئے ہیں اب ہم کو سبقاً سبقاً پڑھنے کی کیا ضرورت۔ میں کہتا ہوں کہ اُردو میں تو طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ تو کیا اپنے مطالعہ کے بھروسے کبھی اپنی بیوی کو بھی کتاب دیکھ کر مسہل(۴) دیا ہے۔ اگر ترجمہ کے بعد پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی تو ذرا قرابادین(۵) سے نسخہ دیکھ کر اپنی بیوی کو تو مسہل دے لو، یقیناً آپ ایسی جرأت نہیں کر سکتے اور اگر کوئی

(۱) ''قرآن میں علوم دینیہ سب ہیں مگر ہماری فہم ان کے سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے اس کی شرح کے لئے ہم کو حدیث کی ضرورت ہے'' (۲) شریعت بنانے والے نہیں ہیں (۳) بلکہ شریعت کی تشریح کرنے والے ہیں (۴) دست آور دواء (۵) طب کی ایک کتاب کا نام۔

جرأت کرے گا تو یقیناً غلطی کرے گا۔ اول تو مزاج کی رعایت نہ کر سکے گا، پھر ادویہ کے اوزان میں کتاب کا اتباع کر کے مریض کو تباہ کرے گا اور اگر ان سب باتوں کی بھی رعایت کر لی تو بحران (۱) کی رعایت کیسے کر لو گے جو ایسی نازک اور لطیف بحث ہے کہ ڈاکٹر بھی اب تک وہاں نہیں پہنچے۔ اس کو اطباء یونان ہی خوب سمجھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان کو الہام ہوا ہے۔ ہم کو تو ہر چیز میں حق تعالیٰ کی صنعت نظر آتی ہے۔ چنانچہ بحران کی بحث دیکھ کر بھی ہم کو حق تعالیٰ ہی کی حکمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حکماء یونان کی اس بحث کو پڑھ کر ہم یوں کہتے ہیں۔

چہ باشد آن نگار خود کہ بندد ایں نگارہا(۲)

بحران کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ تجربہ سے یا الہام سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اثناء مرض (۳) میں بعض ایام ایسے ہوتے ہیں جن میں طبیعت اور مرض میں تدافع ہوتا ہے (۴) طبیعت مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت پر غالب آنا چاہتا ہے اور اس کی معین تاریخیں ہیں جن کو اطباء نے بیان کیا ہے، اسی واسطے تیمارداروں کو چاہئے کہ ابتداء مرض کی تاریخ کو محفوظ (۵) رکھیں تا کہ طبیب کو ایام بحران (۶) دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ پھر واقعی یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان تاریخوں میں مریض کو کرب و تعب (۷) اور ایام سے زیادہ ہوتا ہے، جو طبیب ماہر ہے وہ پہلے سے بحران کی رعایت کر کے طبیعت کو قوت پہنچانے کی تدبیر کرتا ہے۔ اب بتلایئے اگر کوئی شخص کتابیں دیکھ کر مسہل دینا چاہے وہ بحران کی رعایت کیسے کرے گا۔ کیونکہ مسہل کے باب میں بحران کا ذکر ہی نہیں بلکہ اس کا ذکر دوسرے باب میں ہے۔ ہاں جس نے باقاعدہ فن کو حاصل کیا ہو اور مطب بھی کیا ہو اس کی نظر تمام ابواب پر ہو گی، وہ مسہل (۸) میں بھی بحران کی رعایت کرے گا۔ ان تاریخوں میں مسہل نہ دے گا۔

---

(۱) بیماری کے زور کا دن (۲) ''وہ خود کتنا حسین ہو گا جس کے یہ نقش و نگار ہیں'' (۳) دوران مرض (۴) ایک دوسرے سے مدافعت کرتے ہیں (۵) جس تاریخ کو بیمار ہوا تھا اس کو یاد رکھے (۶) مرض میں شدت کے دن (۷) تکلیف و تھکاوٹ (۸) دست آور دوا۔

فتویٰ دینے میں احتیاط

اسی واسطے مطالعہ کتب کرنے والوں کو معالجہ کی اجازت نہیں اور اسی واسطے کتابیں دیکھ کر عوام کو افتاء کی اجازت نہیں۔ بلکہ علماء کو بھی سب کو اجازت نہیں، بلکہ فتویٰ وہی دے سکتا ہے جس نے کسی مفتی کے سامنے رہ کر یہ کام کیا ہو اور جس نے ساری عمر درس ہی دیا ہے افتاء کا کام نہیں کیا وہ فتویٰ نہیں دے سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ مفتی کی نظر مختلف ابواب پر حاوی ہوتی ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ مسئلہ جو ایک باب میں مطلق ہے دوسرے باب میں کسی قید کے ساتھ مقید ہے اور یہ بات محض درس دینے سے حاصل نہیں ہوتی، گو اس سے افتاء میں مدد ملتی ہے مگر کافی نہیں۔ کیونکہ مدرس کی نظر میں درس کے وقت سب ابواب نہیں ہوتے۔ تو وہ ایک مسئلہ کو ایک باب میں مطلق دیکھ کر فتوی دے گا اور غلطی کرے گا، کیونکہ دوسرے باب میں ایک قید مذکور تھی جس کی اس نے رعایت نہیں کی۔ چنانچہ اس کی ایک نظیر اس وقت بھی میرے ذہن میں ہے۔ فقہاء نے باب الکنایات میں لفظ اختیاری(۱) کو بھی بیان کیا ہے اور اس کو کنایہ قرار دیا ہے کہ اس سے نیت کے بعد طلاق ہو جاتی ہے۔ اس سے بہت لوگ یہ سمجھیں گے کہ صرف نیت کے بعد طلاق معاً(۲) واقع ہو جائے گی، حالانکہ یہ غلط ہے، بلکہ نیت کے بعد قبول مراۃ(۳) کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ما اخترن، نفی یا اخترت الطلاق کہہ دے(۴)۔ اگر اس نے اختیار کو قبول بھی نہ کیا تو نیت زوج کے بعد بھی طلاق نہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ اختیاری کنایہ ہونے کے ساتھ لفظ تفویض بھی ہے اور تفویض میں قبول شرط ہے(۵)۔ چنانچہ فقہاء نے باب التفویض میں اختیاری کا ذکر دوبارہ کیا ہے اور وہاں اشتراط قبول کی تصریح کی ہے۔ اب جو شخص صرف ایک باب کو دیکھے گا وہ اس کی رعایت کیسے کر سکے گا۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جو فقیہ مختلف ابواب کو جمع نہ کرے وہ فقیہ نہیں سفیہ(۶) ہے۔

---

(۱) میں نے تجھے طلاق کا مختار بنایا (۲) فورا طلاق واقع ہوجاتی ہے (۳) عورت کے قبول کرنے کی بھی ضرورت ہے (۴) عورت کہے میں نے اختیار نہیں کیا یا طلاق کو اختیار کرلیا (۵) حق طلاق تفویض کرنے میں جس کو تفویض کیا جائے اس کا قبول کرنا بھی شرط ہے (۶) بے وقوف۔

پھر جو لوگ محض اُردو رسائل دیکھ کر اجتہاد کرنے لگتے ہیں ان کا تو کیا پوچھنا! وہ تو عجیب عجیب غلطیاں کریں گے۔

احمقانہ اجتہاد

چنانچہ ایک جنٹلمین تھانہ بھون آئے اور وہ تھانہ بھون ہی کے رہنے والے تھے۔ ظہر کی نماز میں وہ میرے پیچھے شریک جماعت ہوئے اور دو رکعت پر سلام پھیر کر بیٹھ گئے۔ مجھے نماز ہی میں معلوم ہوگیا۔ ہماری نماز ایسی کہاں جس میں کسی کو کچھ بھی خبر نہ ہو۔ یہ تو اہل استغراق کی شان ہوتی ہے۔ ہمارا خیال تو کبھی کبھی نمازیوں کی طرف چلا جاتا ہے اور گوشہ ہائے چشم (۱) سے مقتدیوں کے افعال کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ میں نے سلام پھیر کر دریافت کیا کہ آپ درمیان میں نماز ختم کر کے کیوں بیٹھ گئے۔ تو وہ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ میں مسافر ہوں، اس لئے قصر کیا ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ! حفظت شیئاو غابت عنك اشیاء (۲) وطن میں اور مسافر؟ پھر وطن بھی نہ ہوتا تو مقیم کے پیچھے مقتدی کو قصر کیسا؟ ان حضرت نے یہ مسئلہ تو یاد کر لیا کہ مسافر پر قصر واجب ہے اور یہ نہ دیکھا کہ وطن مبطل سفر (۳) ہے اور اقتداء بالمقیم متمم فرض ہے (۴)۔ اسی طرح ایک مسخرہ شخص ہمیشہ چار رکعتوں کی بجائے دو رکعت پڑھا کرتا تھا اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتا کن فی الدنیا کانک غریب (۵) اور کہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ دنیا میں مسافر بن کر رہو۔ میرا اس حدیث پر عمل ہے، اس لئے میں مسافروں جیسی نماز پڑھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے اگر ابواب احکام سے قطع نظر کر کے صرف الفاظ پر نظر کر کے نکل سکتا ہے تو صرف یہ کہ تم چار رکعتوں کو مثل دو کے پڑھ لیا کرو، یعنی ایسی تیز پڑھو کہ چار رکعتیں دو کے وقت میں ختم ہو جائیں، جیسے جلال آباد میں ایک آقا اور نوکر نماز میں مقابلہ کرتے تھے کہ دیکھیں پہلے کون پڑھتا ہے۔ اس مقابلہ میں ان کی چار

(۱) نگاہ کے کناروں سے (۲) ایک چیز کی رعایت کی اور بہت سی باتوں سے نظر ہٹ گئی (۳) وطن میں ہونا مسافرت کو ختم کر دیتا ہے (۴) مسافر جب مقیم کی اقتداء کرے تو فرض پورے پڑھے گا (۵) ''دنیا میں مسافر بن کر رہ''، الصحیح للبخاری ۸:۱۱۰''۔

رکعتیں اتنی جلدی ہوتی تھیں کہ دوسروں کی ایک رکعت بھی پوری نہ ہوتی۔ تو ایسے ہی تم جلدی پڑھ لیا کرو لیکن یہ بات اس حدیث سے نہیں نکلتی کہ تم چار کی دو رکعتیں کر دو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کن فی الدنیا غریبا (۱) بلکہ کن في الدنیا کانك غریب (۲) فرمایا ہے۔ پس تم مسافر جیسے ہو جاؤ، پورے مسافر کدھر سے ہو گئے۔ تو نے کانك غریب کو فانك غریب پر کیسے محمول کر لیا اور یہ بھی محض اسکاتِ خصم (۳) جاہل کے لئے الزامی جواب تھا۔ ورنہ حقیقی جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کا یہ ارشاد ہے یقیناً آپ اس ارشاد پر سب سے زیادہ عامل تھے۔ اب دیکھ لو کہ نماز کے بارے آپ کا کیا عمل تھا۔ احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ آپ حضر میں چار رکعتیں پڑھتے تھے اور سفر میں دو۔ معلوم ہوا کہ کانك غریب (مسافر کی طرح) سے آپ کی مراد یہ نہیں کہ حالت اقامت میں اپنے اوپر احکام سفر بھی جاری کر لو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ دنیا سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔ جیسا کہ مسافر سرائے سے یا منزل راہ سے دل نہیں لگاتا۔

ضرورت علماء

غرض دین کے سمجھنے کے لئے عوام کو علماء کی سخت ضرورت ہے۔ محض ترجمہ ہدایہ و عالمگیری کا مطالعہ کر لینا ان کو کافی نہیں ہوسکتا۔ ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کتب طب کا مطالعہ کر کے اپنی بیوی کو خود مسہل کیوں نہیں دے لیتے؟ رہا یہ سوال کہ پھر تراجم سے فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ سے محض زبان کی سہولت ہوگئی۔ مضامین کی سہولت ترجمہ سے نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ استاد ہی سے پڑھنے پر موقوف ہے۔ ورنہ اہل عرب کو حدیث و قرآن کے پڑھنے کی ضرورت نہ ہوا کرتی۔ کیونکہ ان کی تو زبان ہی عربی ہے جو قرآن وحدیث کی زبان ہے۔ مگر جا کر دیکھ لیا جائے کہ وہ بھی تعلیم و تعلم سے مستغنی نہیں ہیں اور عوام تو علماء سے کیا مستغنی ہوتے۔ علماء بھی خود علماء سے مستغنی نہیں

(۱) ''دنیا میں مسافر بن کر رہ'' (۲) ''دنیا میں مسافر کی طرح رہ'' (۳) مخالف کو خاموش کرنا ہے۔

ہیں۔ ان کو بھی اپنی ذاتیات میں ہمیشہ اور غیر ذاتیات میں بھی احیاناً(۱) دوسرے علماء سے استفسار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے صاحب الغرض مجنون اور رای العلیل علیل (۲) جب کوئی ذاتی معاملہ کسی عالم کو درپیش ہوتا ہے تو اگر وہ صاحب حیثیت ہے اس کو اپنے فہم پر اعتماد نہیں ہوتا، کیونکہ یہ خدشہ باقی رہتا ہے کہ کہیں اپنی غرض کی وجہ سے میں نے یہ فتویٰ اپنے موافق نہ نکال لیا ہو اور دوسرے پہلوؤں پر اس لئے نظر نہ کی گئی ہو کہ وہ میری غرض کے خلاف ہیں۔ پھر جب تک دوسرے علماء سے مراجعت نہ ہو جائے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا۔

علماء کو مشورہ

اسی واسطے میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ اپنے معاملات میں اپنے فتویٰ پر ہرگز اعتماد نہ کرو بلکہ دوسرے علماء سے رجوع کرو۔ اور زید عمرو کے نام سے استفتاء کروتا کہ دوسرا شخص آزادی سے فتویٰ دے سکے اور تمہارا نام دیکھ کر رعایت نہ کرے۔ دوسرے اپنے معاملات میں اپنے فتوے پر اس لئے بھی اعتماد نہ چاہئے کہ صاحب معاملہ پریشان ہوتا ہے اور پریشانی میں رائے مختل ہوجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محتاط طبیب اپنے گھر والوں کا علاج خود نہیں کرسکتا، کیونکہ اپنے عزیز کی بیماری سے اس کی طبیعت مشوش (۳) ہو جاتی ہے، اسی طرح وکلاء اپنے معاملات میں خود وکالت نہیں کرتے بلکہ دوسرے شخص کو وکیل بناتے ہیں۔ ایک وکیل سے میں نے پوچھا تھا کہ آپ کو تو اپنے مقدمات میں کسی کو وکیل بنانے کی ضرورت نہ ہوتی ہوگی۔ کہا ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ آپ تو خود وکیل ہیں۔ تو انہوں نے یہی وجہ بیان کی کہ اپنے معاملہ میں دماغ پریشان اور طبیعت مشوش ہوتی ہے، اس لئے اپنی رائے کام نہیں دیتی بلکہ دوسرے ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ ہاں امداد اس کو دیتے رہتے ہیں، کیونکہ آخر تو یہ کام ہم کو بھی آتا ہے اور دو کی رائے اچھی ہوتی ہے۔ تو جب علماء کو بھی علماء سے استغناء نہیں تو عوام کو کیونکر استغناء ہوسکتا ہے۔

(۱) کبھی کبھی (۲) بیمار کی رائے بھی بیمار کی طرح کمزور ہوتی ہے (۳) پریشان۔

فرقہ قرآنیہ کی جرأت

مگر فرقہ قرآنیہ کی جرأت دیکھئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مستغنی ہوگئے اور کہتے ہیں کہ بس قرآن کافی ہے۔ حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ ایک شخص نے اس کا خوب جواب دیا۔ کہا اچھا تم قرآن سے اعداد رکعاتِ صلوٰۃ(۱) کی دلیل تو بیان کرو۔ اب تو وہ چکر میں آگئے، کیونکہ قرآن میں نماز کی رکعتوں کا عدد کہیں بھی مذکور نہیں۔ تو وہ قرآنی کہنے لگا کہ اس سوال کا جواب کل کو سوچ کر دوں گا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ بناء دریافت کرنے سے پہلے تم نے عمل کیونکر شروع کر دیا۔ جب ان کے نزدیک حدیث و فقہ کوئی چیز نہیں اور قرآن سے اعداد رکعات کا علم ابھی تک ہوا نہیں تو انہوں نے نماز کیوں شروع کر دی۔ ان سے تو وہ گنوار ہی زیادہ سمجھ دار نکلا جسے ایک شخص نے مسئلہ بتایا وھو غدنویت (میں نے کل کے روزہ کی نیت کی) گنوار نے اگلے دن روزہ نہ رکھا اور پوچھنے پر کہا جب نیت یاد ہو جائے گی اس وقت سے روزہ رکھوں گا۔ ابھی سے کیوں بھوکا مروں۔ کیونکہ بدون نیت کے تو روزہ ہوتا ہی نہیں۔ اگلے دن وہ قرآنی دلیل سوچ کر لایا اور اعداد رکعات کی دلیل یہ آیت ہے: ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ فَاطِرِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ جَاعِلِ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ رُسُلًا أُوْلِيٓ أَجۡنِحَةٖ مَّثۡنَىٰ وَثُلَٰثَ وَرُبَٰعَ (۲) تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنیوالے ہیں اور بنایا فرشتوں کو پیغام لانے والا دو تین چار پروں والا) سبحان اللہ! کیا استدلال ہے! اس آیت میں تو حق تعالیٰ نے فرشتوں کے بازوؤں کے اعداد بیان فرمائے ہیں کہ میاں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین، کسی کے چار۔ اس سے رکعات صلوٰۃ کے اعداد پر کیونکر دلالت ہوگئی۔ پھر اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رکعات صلوٰت خمسہ (۳) منقول نہ ہوتیں تو کیا اس آیت سے کوئی شخص نماز کی رکعتوں کا عدد سمجھ سکتا ہے اور وہ بھی اس تعین کے ساتھ کہ دو رکعتیں صبح ہی میں ہوں اور چار ظہر و عصر و عشاء میں اور تین مغرب میں ہر

(۱) نماز کی رکعتوں کی دلیل (۲) فاطر: ۱ (۳) پانچوں نمازوں کی رکعات۔

گز نہیں بلکہ اول تو اس آیت سے رکعت صلوٰۃ پر انتقال ذہن ہی نہ ہوتا اور جو اتفاقاً ہو بھی جاتا تو یہ تعیین تو کسی طرح بھی سمجھ میں نہ آتی کہ دو رکعت فلاں نماز میں ہوں اور تین فلاں میں پھر رکعات صلواۃ کا ثبوت قرآن سے کہاں ہوا بلکہ حدیث ہی سے ہوا کیونکہ ثبوت تو وہ ہے جو دلالت میں خود کافی ہو اور ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہوا اور جس میں ضمیمہ لگانے کی ضرورت ہو، وہ ثبوت نہیں اس احمق نے نظیر کو ثبوت سمجھا۔

ثبوت معراج

یہ مرض آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت عام ہے۔ یہ لوگ اپنے کو بہت عاقل سمجھتے ہیں مگر ان کو علوم کی عقل خاک نہیں۔ ہاں ایک بات میں بڑے عاقل ہیں کہ سب سے زیادہ آکل (۱) ہیں باقی دین میں آکر تو بڑے بڑے ایل ایل بی، ایل بی ہو جاتے ہیں یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے الل (۲) جاتے ہیں اور دین سے نکل جاتے ہیں اور ایسی ہی بے تکی ہانکتے ہیں جس کے سر نہ پاؤں۔ چنانچہ ایک جنٹلمین نے مجھ سے معراج کا ثبوت مانگا میں نے کہا کہ یہ واقعہ ممکن ہے جس میں امتناع عقلی کچھ نہیں اور مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے اس لئے اس کا ماننا لازم (۳) ہے۔ واقعہ ممکنہ کے لئے مخبر صادق کی خبر کافی ثبوت ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ کہنے لگے یہ تو کچھ ثبوت نہ ہوا۔ میں نے کہا اور کیسے ہوگا، کہنے لگے کہ یہ بتلایئے کہ حضور کے سوا کسی اور کو بھی معراج ہوئی ہے؟ میں نے کہا وہ بھی اک واقعہ ہوگا اس میں بھی یہی اشکال ہوگا کہ اس سے پہلے کسی اور کو بھی ہوئی ہے یا نہیں، اگر اس میں بھی یہ اشکال ہوا تو تسلسل لازم آئے گا اور اگر وہاں سے یہ اشکال نہ ہوگا تو وجہ ترجیح کیا ہے؟ آخر آپ کو دوسرے واقعہ میں اشکال کیوں نہ ہوگا اور اس واقعہ میں کیوں ہوا؟ میں نے عقلی طور پر اس طریقہ ثبوت کا لغو ہونا اور صحیح طریقہ سے معراج کا ثابت ہونا اچھی طرح ظاہر کر دیا تھا مگر اس کو سمجھے کون وہ اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ ثبوت نہیں ہوا۔ میں

---

(۱) کھانے والے (۲) الٹے پڑ جاتے ہیں (۳) ایسا کام جو عقلاً محال نہ ہو اور کسی سچے خبر دینے والے نے اس کی خبر دی ہو تو اس کا ماننا ضروری ہے۔

نے کہا حضرت بس اب تو ثبوت کے لئے اس کی کسر ہے کہ میں آپ کے سامنے اڑ کر آسمان میں جاؤں اور اللہ تعالیٰ کے پاس سے رسید لا کر آپ کو دے دوں، اگر اسی کا نام ثبوت ہے تو مجھے اس سے سکوت (۱) ہے اور آپ کا اشکال بھی قابل سقوط (۲) ہے۔ قافیہ تو مل گیا گو، تاء اور طاء (۳) کا فرق رہا۔ مگر عام محاورات میں تاء اور طاء کے فرق کو کون دیکھ سکتا ہے۔ اسی لئے فقہاء نے تلاق اور طلاق اور تلاغ وتلاک میں ہر لفظ سے وقوع طلاق کا حکم کیا ہے کیونکہ محاورات میں مخارج کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مراد ہر صورت میں طلاق ہی ہے۔

جواب لاجواب

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ دہلی میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر علماء سے فتویٰ لینے گیا ایک غیر مقلد مولوی نے فتویٰ دے دیا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ اس شخص نے لفظ طلاق کو طاء سے ادا نہیں کیا بلکہ تاء سے ادا کیا ہے اور تلاق مہمل لفظ ہے اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اب اس کو فقہاء کی تصریح دکھلائی گئی تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حدیث سے یہ دلیل لاؤ۔ فقہاء کے کلام کو ہم نہیں مانتے ۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ دہلوی گو زیادہ عربی پڑھے ہوئے نہ تھے مگر دانا اور تجربہ کار شخص تھے۔ انہوں نے ایسا جواب دیا کہ غیر مقلد مولوی ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ آپ نے کہا کہ اگر تلاق کہنے سے طلاق کا وقوع نہیں ہوا تو اس شخص کا نکاح بھی منعقد نہیں ہوا کیونکہ ایجاب وقبول کے وقت نکاح حاء حطی سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ نکاہ (۴) بولا گیا تھا اور عربی میں نکاہ مہمل لفظ ہے تو اگر اب نکاح نہیں ٹوٹا تو وہ پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہے اور اگر ہاء ہوز سے نکاہ کہنا انعقاد نکاح کے لئے کافی تھا تو تلاق کہنا بھی وقوع طلاق کے لئے کافی ہے اس کا غیر مقلد کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ واقعی خوب کہا اسی واسطے میں نوجوان مولویوں سے کہا کرتا ہوں کہ گو تم کو مسائل یاد زیادہ ہوں مگر پھر بھی تم کو بوڑھوں کی ضرورت ہے کیونکہ ان کو تجربہ وفہم زیادہ ہے گو یادداشت تم سے کم ہو۔ بہر حال اس نے قرآنی تعبیر کو

(۱) ایسے جواب سے خاموشی بہتر ہے (۲) آپ کا اشکال بھی قابل رد ہے (۳) قافیہ میں دونوں کلمات کے آخر میں تاء ہونی چاہئے ۔ یہاں ایک کلمہ میں طاء دوسری میں تاء، لیکن دونوں کا مخرج ایک ہے اس لیے متشابہ الصوت ہونے کی وجہ سے قافیہ مل گیا گو حروف میں فرق ہے (۴) ھائے ہوز سے بولا گیا تھا۔

ثبوت سمجھا اور دلیل میں جَاعِلِ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةِ رُسُلًا أُوْلِىٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَـٰثَ وَرُبَـٰعَ (۱) کو پیش کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرشتوں کے اعداد اجنحہ (۲) سے رکعات صلوٰۃ کا ثبوت ہوسکتا ہے تو فَٱنكِحُوا۟ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ ٱلنِّسَآءِ مَثْنَىٰ وَثُلَـٰثَ وَرُبَـٰعَ (۳) سے بھی ثبوت ہوسکتا ہے کیونکہ عدد کا ذکر تو وہاں بھی ہے اور اس کی بھی کچھ ضرورت نہیں خود تمہارے جسم میں بھی موجود ہیں بس تم نے ثبوت میں اپنے کو پیش کر دیا ہوتا۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر وخود گِل کوزہ (۴)

صوفیہ نے تو کچھ سمجھ کر کہا تھا کہ انسان میں تمام عالم منطوی (۵) ہے آسمان و زمین عرش وکرسی لوح وقلم سب انسان کے اندر مجتمع ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ کہتے ہیں:

دواك منك و ما تشعر — دواك منك وما تبصر
وانت الكتاب المبين الذي — با حرفه ينظر المضمر
وتزعم انك جرم صغير — وفيك انطوى العالم الأكبر (۶)

مگر اس قرآنی فرقے نے بے سمجھے ہی اپنے اندر سے رکعات کا ثبوت بتلا دیا ہوتا بلکہ یہ جواب دیتا تو رموز واسرار میں سے سمجھا جاتا اور اب جو اس نے ثبوت دیا ہے اس سے تو اپنی حماقت وجہل کا اظہار کیا ہے جس کا منشاء یہ تھا کہ اس نے حدیث سے اپنے کو مستغنی کرنا چاہا مگر ہم کو چونکہ حدیث سے استغناء نہیں اس لئے کہ ہم کو بحمد اللہ معلوم ہوگیا کہ اس جگہ اٰتی الزکوۃ (زکوٰۃ دو) میں تکرار نہیں ہے بلکہ یہاں فرض کا ذکر ہے اور اوپر غیر زکوٰۃ کا ذکر ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان فی المال حقاً سوی الزکوۃ (۷) ثم تلا هذه الآیة (مال میں زکوۃ کے علاوہ

(۱) ''بنانے والا، فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں'' فاطر:۱ (۳) ''پس نکاح کرو عورتوں میں سے جسے تم پسند کرو دو اور تین اور چار'' النساء:۳ (۲) پروں کی تعداد سے (۴) ''خود آبخورہ، خود آبخورہ بنانے والا اور خود ہی وہ مٹی جس سے آبخورہ بنایا گیا'' (۵) سارے عالم کے شواہد ہیں (۶) ''تمہاری دوا خود تم سے ہے اور تمہیں اس کا علم نہیں اور تیری بیماری تجھ سے ہے اور تو نہیں دیکھتا اور تو کھلی کتاب ہے جس کا پوشیدہ حرف حرف نظر آتا ہے اور تو اپنے آپ کو چھوٹے جسم کا خیال کرتا ہے حالانکہ عالم اکبر تجھ میں سمایا ہے (اس دنیا میں موجود تمام اشیاء کا نمونہ انسان میں موجود ہے اسی لیے انسان کو عالم اصغر کہتے ہیں)'' (۷) سنن الترمذی: ۶۹۵۔

بھی حق ہے۔ اور پھر یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی)

ایک سوال کا جواب

البتہ ایک سوال باقی رہے گا کہ طاعات بدنیہ میں فرض و نفل کو الگ الگ کیوں نہیں بیان کیا گیا بلکہ سب کو اقام الصلوٰۃ ہی میں جمع کر دیا گیا اور زکوٰۃ میں دونوں کو جدا جدا کیوں بیان کیا گیا۔ اس کا جواب وہی ہے جو اوپر رفع تکرار کے لئے علی سبیل التنز ل دیا گیا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ طبائع میں بخل غالب ہے اور طاعات مالیہ میں کوتاہی زیادہ کی جاتی ہے اگر یہاں تفصیل نہ کی جاتی تو صدقات نافلہ کا کسی کو بھی اہتمام نہ ہوتا اس لئے یہاں فرض و نفل کو جدا جدا بیان فرما دیا گیا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَٱلۡمُوفُونَ بِعَهۡدِهِمۡ إِذَا عَٰهَدُواْۖ وَٱلصَّٰبِرِينَ فِي ٱلۡبَأۡسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلۡبَأۡسِ (۱)

جملہ اولی میں آداب معاشرت کا ذکر ہے اور جملہ ثانیہ میں اخلاق و ملکات باطنہ (۲) کا۔ اب بتلائیے اس آیت سے دین کا کون سا شعبہ باقی رہ گیا۔ کوئی نہیں بلکہ تمام ابواب دین اس میں مذکور ہیں۔ عقائد بھی اور طاعات مالیہ و بدنیہ بھی اور معاملات و معاشرات بھی اور اخلاق بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق بھی دین میں داخل ہیں جن کو عام طور پر آج کل دین سے خارج سمجھا جاتا ہے مگر اس سے وہ اخلاق مراد نہیں جن کو آج کل اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسا اختراع ہے جیسے ہمارے ایک ہم عصر نے تواضع کی تفسیر میں اختراع (۳) کیا تھا جب وہ کریما پڑھتے تھے اور اس میں تواضع کا ذکر آیا۔

دلا گر تواضع کنی اختیار　　　شود خلق دنیا ترا دوستدار (۴)

تو اگلے دن جب سبق سنانے بیٹھے حضرت استاد نے پوچھا بتلاؤ تواضع کسے کہتے ہیں؟ کہا یہی حقہ پان دے دینا اس جواب پر وہ خوب پٹے مگر ساری عمر کے لئے

(۱) ''اور اقرار کرنے کے بعد اپنے عہد کو پورا کرنے والے اور صبر کرنے والے مستحق ہیں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت'' بقرہ: ۱۷۷ (۲) باطنی خوبیوں کا (۳) تفسیر گھڑی ہے (۴) ''اے دل اگر تو تواضع اختیار کرے گا تو تمام مخلوق تجھ کو محبوب رکھے گی''۔

تواضع کی حقیقت یاد ہوگئی کہ حقہ پان دینے کا نام تواضع نہیں تو جیسے انہوں نے تواضع کی تعریف گھڑی تھی۔

آج کل اخلاق کی تعریف

اسی طرح آج کل اخلاق کی تفسیر گھڑی گئی ہے اس زمانہ میں اخلاق کے یہ معنی ہیں کہ جب کوئی ملنے آئے اسی کے ہو کر بیٹھ جاؤ اور اپنے سب کاموں کو چولہے میں ڈال دو اور آنے والے کے ساتھ باتیں بناتے رہو اور بدخلقی یہ ہے کہ تمہارے ہو کر نہ بیٹھیں بلکہ حسب ضرورت مزاج پرسی وغیرہ کر کے اپنے کام میں لگ جائیں اور زیادہ باتیں نہ بنائیں۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ کی نسبت میں نے جہلاء کو یہ کہتے ہوئے خود سنا ہے کہ مولانا کے اخلاق اچھے نہیں۔ بس ان کی بدخلقی یہی تھی کہ ان کے ساتھ دیر تک باتیں نہ بناتے تھے۔ چنانچہ ایک ڈپٹی صاحب درس حدیث کے وقت مولانا سے ملنے گئے۔ مولانا نے اس کی بہت زیادہ رعایت کی کہ درس کے وقت اس سے مصافحہ اور سلام وجواب کر لیا اور یہ بھی دریافت فرمالیا کہ کیسے تشریف لائے؟ کچھ کہنا ہے انہوں نے کہا نہیں۔ ویسے ہی زیارت کو حاضر ہوا ہوں اور اس جواب پر مولانا درس میں مشغول ہو گئے اور دو گھنٹہ تک ان سے بات نہ کی۔ بس اس پر ڈپٹی صاحب خفا ہو گئے اور باہر آ کر بہت شکایت کی کہ مولانا بہت روکھے ہیں۔ دو گھنٹہ تک ہم بیٹھے رہے۔ ہم سے ایک بات نہیں کی اپنے ہی کام میں لگے رہے۔ وہ جانتے نہیں کہ میں کون ہوں اور پہلے سلاطین کی یہ حالت تھی کہ وہ علماء وصلحاء کے سامنے دم نہ مارتے تھے۔

شاہ فقیر کے دروازہ پر

سلطان شاہ جہاں مع ایک عالم کے شاہ سلیم چشتی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ سلیم نے بادشاہ کو دیکھ کر پیر پھیلا دیئے۔ شاہ جہاں تو کچھ نہیں بولے مگر ان عالم کو یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ پوچھا شاہ صاحب آپ نے پاؤں کیسے پھیلا دیئے جو کہ خلاف ادب ہے۔ فرمایا جب سے ہاتھ سمیٹ لئے پاؤں پھیلا دیئے۔ یہ بامعنی جواب

سن کر عالم بھی دم بخود رہ گئے لیکن آخر تو مولوی تھے یہ دوسرے طریق سے چلے کہا دیکھئے آپ کی خدمت میں سلطان اسلام تشریف لائے ہیں جو اولی الامر میں سے ہیں اور اولی الامر کی تعظیم فرض ہے۔ ان کا ادب کیجئے۔ فرمایا یہ تمہارے سلطان ہوں گے تم ان کا ادب کرو، میرے تو غلامانِ غلام ہیں مولوی صاحب نے پوچھا کہ آپ کے غلامانِ غلام کدھر سے ہوئے۔ فرمایا یہ ہوا و ہوس (۱) کے غلام ہیں اور ہوا و ہوس میرے غلام ہیں یہ جواب سن کر شاہ جہاں بہت متاثر ہوئے اور رونے لگے۔ اسی طرح ایک اور بادشاہ کا قصہ ہے کہ وہ کسی بزرگ سے ملنے گئے۔ خانقاہ کے دروازہ پر پہنچے تو نقیب نے روک دیا کہ یہیں ٹھہریئے میں حضرت شیخ کو اطلاع کر دوں وہ اجازت دیں تب آگے بڑھیے گا۔ بادشاہ کو نقیب کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا مگر چونکہ عقیدت و نیاز مندی کے ساتھ آئے تھے اس لئے ضبط کیا اور جب اجازت مل گئی تب اندر پہنچے، بھرے ہوئے تو تھے ہی سامنے پہنچتے ہی یہ مصرع پڑھا:

درِ درویش راہ دربان نباید (۲)

درویش نے فوراً جواب دیا

بباید تا سگ و دنیا نیاید (۳)

کیسا بے ساختہ اور پر مغز جواب ہے مگر اس زمانہ کے سلاطین کی اہلیت دیکھئے کہ باوجود سلطنت کے اپنے معتقد فیہ (۴) کی ہر نا گوار و تلخ بات کا تحمل کرتے تھے کیونکہ اعتقاد کا تو واقعی یہی مقتضا ہے اور یہ بھی کوئی اعتقاد ہے کہ بزرگ صاحب ہمارے مذاق کے موافق ہم سے برتاؤ کریں تو بزرگ ہیں ورنہ بداخلاق ہیں یہ تو بزرگ کے ساتھ اعتقاد نہ ہوا بلکہ اپنے ساتھ اعتقاد ہوا۔ چنانچہ آج کل یہی حالت ہے جیسا کہ وہ ڈپٹی صاحب گئے تو تھے اعتقاد کے دعوے سے اور جب ان کے خلاف مزاق کوئی بات ہوئی تو لگے شکایت کرنے اور دھمکیاں دینے کہ خبر بھی ہے میں کون ہوں اور یہ نہ سمجھا کہ ان پر مولانا کا کون سا کام اٹکا ہوا تھا جو وہ ڈرتے یا ڈپٹی صاحب ان کا کچھ بگاڑ لیتے۔ ہاں اپنے

(۱) خواہشات اور مال (۲) ''درویش کے دروازہ پر دربان نہیں ہونا چاہئے'' (۳) ''ضرور ہونا چاہیے تا کہ دنیا کا کتا اس کے گھر میں نہ گھس آئے'' (۴) جس سے ان کو اعتقاد ہوتا تھا اس کی ہر سخت بات برداشت کرتے تھے۔

زعم میں انہوں نے ایک ضرر مولانا کو پہنچایا کہ سال نو میں جو گورنمنٹ کی طرف سے خطابات عطا ہوتے ہیں ان میں مولانا کے لئے بھی شمس العلماء کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس کو روک دیا اور لکھ دیا کہ مولانا اس خطاب کے مستحق نہیں اور یہ کارروائی کر کے آپ بہت خوش ہوئے اور فخر سے کہا کہ دیکھا ہم نے مولانا سے کیسا بدلہ لیا کہ ان کو خطاب ملنے والا تھا۔ ہم نے روک دیا۔ ہائے وہ بچارہ واقعی معذور تھا کیونکہ اسے بزرگوں کے مذاق کی خبر ہی نہ تھی وہ اپنے زعم میں اس کو اضرار(۱) سمجھے ہوئے تھا حالانکہ مولانا کے لئے خطاب کا نہ ملنا عید ہو گیا وہ تو خطاب ملنے کو اپنا اضرار سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ بات بھی مولانا تک پہنچی۔ آپ بہت ہنسے، فرمایا اس میں مجھے کیا ضرر پہنچا بلکہ ڈپٹی صاحب تو میرے محسن ہیں کہ مجھے دربار وغیرہ کی حاضری سے بچالیا کیونکہ شمس العلماء کو درباروں میں جانا پڑتا ہے مگر وہ شمس مخسوف(۲) ہیں جو در در مارے پھرتے ہیں اور جو شمس غیر مخسوف ہوگا وہ کسی کے در پر نہ جائے گا بلکہ سب اسی کے پاس آئیں گے اور مولانا دوسری قسم کے شمس تھے نہ پہلی قسم کے۔ اب اگر مولانا کے پاس خطاب پہنچتا تو طبیعت تو اس کے قبول سے اباء(۳) کرتی مگر اس کا واپس کرنا مصالح کے خلاف ہوتا کیونکہ اس میں گورنمنٹ کے خطاب کی توہین ہوتی جس کو یہ حضرات گوارا نہ کرتے تھے اور مولانا کے مذاق کو کون سمجھتا جو واپسی کو عذر پر محمول کیا جاتا۔ غرض خطاب کے آنے سے مولانا بڑی ضیق(۴) میں پڑ جاتے۔ ڈپٹی صاحب نے بالا بالا ہی اسے واپس کر کے مولانا کو ایک بہت بڑی ضیق سے نجات دے دی مگر وہ اپنے دل میں یہ سمجھتے رہے کہ میں نے مولانا کو بڑا نقصان پہنچایا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد(۵)

اور یہ سارا غصہ اس پر تھا کہ مولانا ان کے ساتھ باتیں بنانے نہیں بیٹھے تھے۔

(۱) نقصان پہنچانا (۲) گرہن زدہ سورج (۳) انکار کرتی (۴) تنگی میں (۵) ''اگر خداوند کریم چاہے تو دشمن ہی بھلائی کا ذریعہ بن جائے''۔

آداب ملاقات

اسی طرح ایک تحصیل دار صاحب نے مولانا کی شکایت کی کہ دو پہر کو ملنے گیا تھا مولانا اس وقت جاگ رہے تھے مگر مجھے دیکھ کر قصداً پشت پھیر لی اور مجھ سے بات تک نہ کی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو مولانا نے بہت اچھا کیا کیونکہ اس شخص نے بے اصول کام کیا۔ بھلا دو پہر کا وقت بھی کوئی ملنے کا وقت تھا۔ یہ وقت اہل اللہ کے لئے آرام کا وقت ہے کیونکہ وہ رات اتنے سویرے اٹھتے ہیں کہ اہل دنیا کو اس وقت نیند کی مستی میں دنیا و دین کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اب جو شخص رات کو تین چار گھنٹے جاگتا ہو وہ اگر دو پہر کو ایک دو گھنٹہ سو لے تو کیا ظلم ہے بلکہ قیلولہ تو سنت ہے مگر افسوس یہ ہے کہ لوگ آج کل انگریزوں سے تو ان کی فرصت کا وقت معلوم کر کے ملتے ہیں اور بزرگوں ملاؤں سے اپنی فرصت دیکھ کر ملتے ہیں۔ وہاں تو اپنا کام چھوڑ کر دن بھر اس لئے ضائع کرتے ہیں کہ صاحب کو جس وقت فرصت ہو اس وقت فوراً حاضر ہو جائیں اور یہاں اپنے سب کاموں سے فارغ ہو کر جب اپنی فرصت دیکھی بزرگوں کے پاس ان کا وقت ضائع کرنے کو حاضر ہو گئے۔ ان کو اتنی عقل نہیں کہ یہ وقت ہماری فرصت کا ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ دوسرے کی بھی فرصت کا ہو۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس بھی دو پہر کو بعض لوگ ملنے آتے تھے، مگر حضرت اتنے نرم تھے کہ سب کے ساتھ بیٹھے رہتے اور ان کی باتیں سنتے رہتے۔ آنکھوں میں نیند ہوتی سر جھکا جاتا مگر طبیعت پر جبر کر کے بیٹھے رہتے۔ بعض دفعہ کسی خادم نے اگر کہہ دیا کہ یہ وقت ملاقات کا نہیں ہے حضرت کے آرام کا وقت ہے تو حضرت خادم پر خفا ہوتے کہ تم روکنے والے کون ہو؟ یہ بے چارے محبت سے آتے ہیں اگر مجھے تھوڑی سی تکلیف ہی ہو جائے گی تو کیا بڑی بات ہے اپنے دوستوں کے لئے آدمی تکلیف بھی گوارا کر لیا کرتا ہے۔ اس کے بعد خادم خاموش ہو گئے اور لوگوں نے بھی طریقہ اختیار کر لیا کہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر دو پہر کو حضرت کے پاس آ بیٹھے۔ ایک دن حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے دو پہر کو دیکھا کہ ایک صاحب حضرت کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ خوب دھمکایا کہ رات کو تو بیویوں کو بغل میں رکھو اور صبح

کو آٹھ بجے سو کر اٹھو۔ نہ تہجد کی پرواہ نہ صبح کی نماز کی، نہ جماعت کا خیال اور دو پہر کو اپنے سب کاموں سے فارغ ہو کر آئے بزرگوں کا وقت ضائع کرنے۔ رات کو دو بجے سے جاگ اٹھتے ہیں، پھر صبح تک نہیں سوتے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ خبردار! جو آج سے کوئی دو پہر کو آیا ٹانگیں چیر دوں گا۔ حافظ صاحب کے دھمکانے پر حضرت کچھ نہیں بولے، پھر اس دن سے کوئی ایسے وقت میں نہ آیا تھا۔

طریق اصلاح

اس کی بھی ضرورت ہے کہ کچھ بزرگ ایسے بھی ہوں اگر سارے نرم ہی ہوں تو پھر اصلاح کیونکر ہوگی کیونکہ جو بزرگ نرم مزاج ہوتے ہیں وہ خود کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ ہاں جو طریقہ پوچھتا ہے اسے بتلا دیتے ہیں مگر اس طرح پوچھ پوچھ کر بھی کہیں اصلاح ہوئی ہے۔ اگر بچوں سے ان کے پوچھنے پر خطاب کیا جائے اور بے پوچھے ان کی اصلاح نہ کی جائے تو بس ہو چکی اصلاح کیونکہ ان کا مزاج تو یہ ہے کہ پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب جو کھیلو گے کو دو گے ہو گے نواب۔ یہ تو نظم ہے اور ایک نثر بھی ہے پڑھیں تو مریں، نہ پڑھیں تو مریں، پھر دانتا کل کل کیوں کرن۔ اب ان کا یہ مزاج ہو ان کو انہی کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً جاہل کودن (۱) اور بداخلاق ہی رہیں گے۔ اصلاح کی صورت یہ ہے کہ مصلح ظاہر میں عربی بدخلق بن جائے۔ امیر شاہ خان صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مقولہ نقل فرماتے تھے کہ جس کا پیر بڑا (تیز) نہ ہو اس مرید کے اخلاق ہمیشہ خراب رہیں گے۔ واقعی مرید کی اصلاح جبھی ہوتی جب پیر تھوڑا سا بدخلق بن جائے ورنہ اصلاح نہیں ہوتی جیسے خلیفہ مامون رشید کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ قاضی یحییٰ بن اکثم ان کے یہاں مہمان ہوئے۔ رات کو خلیفہ نے کسی ضرورت سے ایک غلام کو پکارا، کوئی نہ بولا۔ دوبارہ پھر آواز دی، اب بھی کوئی نہ بولا۔ تیسری بار پکارا تو ایک غلام جھلاتا ہوا بڑبڑاتا اٹھا کہ نہ دن میں چین ہے نہ رات کو چین ہے۔ دن بھر سامنے حاضر رہتے ہیں اور یہاں سے وہاں بھاگے پھرتے ہیں، رات کو بھی چین نہیں۔ ذرا آنکھ لگی

(۱) احمق۔

یا غلام یا غلام اس سے تو سارے غلاموں کو پھانسی ہی دے دو۔ قاضی یحییٰ بن اکثم کو غلام کی اس بے باکی اور گستاخی پر بڑا غصہ آیا اور کہا امیر المومنین آپ نے غلاموں کو سخت گستاخ بنا رکھا ہے، ان کی اصلاح کیوں نہیں فرماتے۔ مامون نے جواب دیا کہ اے یحییٰ ان کی اصلاح تو بہت آسان ہے اور بعض دفعہ خیال بھی آیا کہ اصلاح کروں مگر ان کی اصلاح اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ میں اپنے اخلاق خراب کروں۔ بس اس وجہ سے اصلاح نہیں کرتا کہ ان سسروں کی اصلاح کے لئے میں اپنے اخلاق کیوں بگاڑوں۔ مامون کو تو غلاموں کی وجہ سے اپنے اخلاق بگاڑنے کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ غلام اس کے پاس طالب اصلاح ہوکر نہ آئے تھے۔ نہ مامون نے ان سے اصلاح کا عہد کیا تھا مگر شیخ کو اس کی ضرورت ہے کیونکہ مریدین اپنے آپ کو اس کے سپرد کرتے ہیں اور شیخ بھی ان سے اصلاح کا وعدہ کرتا ہے۔ اب معاہدہ کے بعد اصلاح نہ کرنا خیانت ہے جیسے کوئی مریض اپنے کو طبیب کے سپرد کردے اور اس کو مسہل (۱) یا آپریشن کی ضرورت ہو اور طبیب اس لئے مسہل یا آپریشن نہ کرے کہ بیماریوں کہے گا کہ یہ تو بہت سخت حکیم ہے جو ایسے طریقہ علاج کرتا ہے۔ اب بتلایئے مریض کے اس کہنے کا طبیب کو خیال کرنا چاہئے یا اصول کے موافق کام کرنا چاہئے۔ مریض کچھ ہی کہے اور چاہے اس کو کیسی ہی تکلیف ہو کیونکہ صحت جسم سب کو مطلوب ہے مگر نا معلوم شیخ اگر اسی قاعدہ پر عمل کرے تو اس کو بدمزاج بداخلاق کیوں کہا جاتا ہے اور اس پر ملامت کیوں کی جاتی ہے۔ بس اس کا منشا بجز اس کے کیا ہے کہ دین کی صحت مطلوب نہیں۔ غرض اصلاح بدوں اس کے نہیں ہوسکتی کہ شیخ ظاہر میں اپنے کو کسی قدر بدخلق بنائے جیسا مامون نے کہا تھا کہ غلاموں کی اصلاح اس طرح ہوسکتی ہے کہ میں اپنے اخلاق بگاڑوں۔

اخلاق مامون الرشید

مامون کے اخلاق بہت اعلیٰ درجہ کے تھے ایک دفعہ قاضی یحییٰ بن اکثم مامون کے یہاں مہمان ہوئے۔ رات کو انہیں پیاس لگی اور پیاس کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ ادھر

(۱) دست آور دوا دینے کی۔

ادھر کروٹیں بدلنے لگے۔ مامون رشید نے پوچھا یا یحییٰ مالک تتقلب [1] (کیا بات ہے کہ تم کروٹیں بدل رہے ہو) نام لے کر پکارنا بے تکلفی کی وجہ سے تھا ورنہ خلیفہ کے دل میں قاضی صاحب کی جتنی عظمت تھی وہ ابھی معلوم ہو جائے گی۔ انہوں نے بتلایا کہ پیاس لگ رہی ہے۔ خلیفہ نے اس وقت کسی غلام کو آواز نہ دی کیونکہ تھوڑی ہی رات گزری تھی غلاموں کی آنکھ ابھی لگی تھی ان کو جلدی جگانا گوارا نہ ہوا (اور یہاں سے معلوم ہوا کہ پہلا واقعہ جو خلیفہ نے غلام کو پکارا تھا تو اس وقت رات زیادہ گزر چکی تھی اور غلام بقدر ضرورت نیند لے چکے تھے۔ خلیفہ نے کوئی ظلم نہ کیا تھا مگر غلام گستاخ تھے اس لئے صبح سے پہلے جگانا ہی ان کو ناگوار گزرا) تو خلیفہ آہستہ آہستہ خود اٹھے اور گلاس میں پانی لا کر قاضی صاحب کو خود پلایا۔ قاضی یحییٰ نے عرض کیا کہ امیر المومنین آپ نے کسی غلام کو آواز نہ دے دی۔ فرمایا ان کی ابھی آنکھ لگی ہے اس وقت ان کو جگانا مناسب نہ تھا۔ کہا پھر میں خود جا کر پی آتا ہوں۔ فرمایا تم مہمان تھے اور مہمان کا خود پانی پینے کو جانا اکرام ضیف [2] کے خلاف تھا اور قاضی صاحب خود جاتے بھی تو کیا ہوتا ان کو پانی ملتا تھوڑا ہی کیونکہ محل شاہی اتنا وسیع اور بڑا ہوتا ہے کہ اس میں بدون کسی کے بتلائے کیا پتہ لگے کہ پانی کہاں ہے اور پاخانہ کہاں ہے۔

شاہ چین کی وصیت

چنانچہ شاہ چین ایک دفعہ کسی دوسرے بادشاہ کے یہاں مہمان ہوا۔ رات کو پاخانہ کی ضرورت ہوئی اور جگہ معلوم نہ تھی بڑا پریشان ہوا، محل شاہی اتنا بڑا کہ وہاں بیسیوں درجہ طے کر کے زینہ ملتا ہے۔ پھر زینہ کے بعد نہ معلوم کتنے درجے ہوں گے۔ پاخانہ کی کیونکہ خبر ہوئی آخر کار جب کوئی جگہ نہ ملی تو اس نے اپنی چادر میں قضاء حاجت کی اور صبح کے وقت سویرے جنگل میں جا کر خود پھینک آیا اور اپنے ملک میں واپس آ کر اپنے ولی عہد کو یہ وصیت لکھی کہ جب کوئی تمہارے یہاں مہمان ہو تو سب سے پہلے اس کو پاخانہ بتلا دو اور تم بھی کہیں مہمان ہو تو سب سے پہلے پاخانہ دریافت کر لو ورنہ سخت

(۱) تمہیں کیا ہوا کروٹیں بدل رہے ہو (۲) مہمان کے اکرام کے خلاف ہے۔

مصیبت ہوگی ۔ ہاں اگر چھوٹا گھر ہوتو سونگھ سونگھ کر شاید پتہ لگ جائے کہ پاخانہ کون سا ہے۔ بس جہاں سے بد بو آئے گی وہیں پاخانہ ہوگا مگر بعض دفعہ اس میں بھی غلطی کا اندیشہ ہے۔

حکایت

جیسے ایک آزاد شخص نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ واللہ اعلم صحیح تھا یا غلط مگر تکذیب کی وجہ بھی کچھ نہیں وہ کہتے تھے کہ میں اپنے دوست کی شادی میں بنگال گیا اور ان کے یہاں مہمان ہوا۔ رات کو قضاء حاجت کی ضرورت ہوئی، پاخانہ معلوم نہ تھا، میں بڑا پریشان تھا، آخر کار سونگھنا شروع کیا۔ ایک گڑھے میں سے بد بو آئی تو میں سمجھا کہ یہی پاخانہ ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر قضاء حاجت کر لی، صبح کو شادی کی تقریب میں ایک بڑے مجمع کی دعوت تھی۔ قسم قسم کے کھانے لائے گئے آخر میں کسی نے کہا کہ بھائی اچار بھی تو لے آؤ۔ اب میں نے دیکھا کہ ایک شخص اسی جگہ گیا جہاں میں نے قضاء حاجت کی تھی اور اسی گڑھے میں سے جس میں پاخانہ کیا تھا کئی برتن بھر بھر کے لائے جب میں نے اس کی بد بو سونگھی تو یقین آ گیا کہ یہ تو وہی ہے، اب میں نے دیکھا کہ لوگ اس میں سے کھانے لگے۔ میں ڈر کے مارے خاموش رہا کہ اگر تو نے اپنی حرکت کی اطلاع کی تو لوگ تجھے ماریں گے اور وہ سب میرے سامنے اسی میں سے کھاتے رہے، اللہ معاف کرے۔ اس شخص نے بڑی غلطی کی ان کو واقعہ ظاہر کر دینا واجب تھا اور اپنا عذر بھی کہ مجھے اس کی بد بو سے یہ خیال ہوا کہ شاید یہ سنڈاس (۱) ہے، بہر حال مامون رشید نے قاضی یحییٰ بن اکثم کو خود اپنے ہاتھ سے پانی پلایا اور یہ وہ سلاطین تھے جن سے بڑے بڑے سلاطین کانپتے تھے، مگر اس پر بھی علماء صلحاء کا اتنا ادب کرتے تھے کہ خود پانی پلایا، کسی غلام کو بھی نہ جگایا۔

حقیقت اخلاق سے ناواقفی

بہر حال اخلاق یہ نہیں ہیں کہ تمہارے ہی ہو کر بیٹھ جائیں اور باتیں بنانے

(۱) پاخانہ پھرنے کی جگہ۔

لگیں بلکہ اخلاق ملکات باطنہ کا نام ہے وَٱلۡمُوفُونَ بِعَهۡدِهِمۡ إِذَا عَٰهَدُواْۖ وَٱلصَّٰبِرِينَ فِي ٱلۡبَأۡسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلۡبَأۡسِ (۱) میں انہی اخلاق کا ذکر ہے۔ آج کل ان کا پتہ ہی نہیں بلکہ بعض تو ان پر نکیر کرتے ہیں کہ یہ کہاں کی اصلاح ہے کہ خواہ مخواہ مسلمانوں پر بدگمانی کر کے حکم لگاتے ہیں کہ تم میں تکبر ہے تم میں حسد ہے، تم میں عجب ہے، تم کو بدنظری کا مرض معلوم ہوتا ہے۔ یہ محض بدگمانی ہے اور افسوس یہ ہے کہ ان نکیر کرنے والوں میں بعض وہ بھی جو اصلاحی مولوی ہیں اس لئے ان کی حالت عام معترضین سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ مولوی جب بگڑتا ہے تو بہت دور پہنچتا ہے اس وقت وہ مولوی سالار بخش صاحب کی اصطلاح کا مولوی ہو جاتا ہے، مولوی صاحب وعظ میں کہا کرتے تھے کہ آج کل جو کہ مولوی ہیں ان مولوی کی اصل بھی معلوم ہے۔ یہ لفظ ہے مولوی مو کہتے ہیں موسم کو اور لوی کہتے ہیں بٹیر کو، یہ تو موسم کی بٹیریں ہیں۔ مولوی سالار بخش صاحب کو کچھ مراق تھا(۲) مگر بعض لطیفے ان کے بہت اچھے ہوتے تھے۔ بعض باتیں کام کی بھی کہتے تھے تو جو مولوی بگڑتا ہے وہ مولوی صاحب کی تفسیر کے موافق مولوی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے مولویوں نے فتوی لگا دیا کہ مشائخ بدگمانی سے مسلمانوں پر امراض قلبیہ کا حکم لگاتے ہیں اور بدگمانی حرام ہے۔ نص میں موجود ہے۔ ''إِنَّ بَعۡضَ ٱلظَّنِّ إِثۡمٞۖ '' و ''ٱجۡتَنِبُواْ كَثِيرٗا مِّنَ ٱلظَّنِّ ''(۳) مگر میں کہتا ہوں (سخن شناش نہ دلبرا خطا ایں جاست)

بات یہ ہے کہ إِنَّ بَعۡضَ ٱلظَّنِّ إِثۡمٞۖ کو پڑھا تم نے مگر سمجھا ہے مشائخ ہی نے، کیونکہ تمہارے پاس صرف الفاظ ہیں اور ان کے پاس معانی ہیں۔

حاجی صاحب کا مرتبہ

دیوبند میں سے ایک رئیس مجھے کہنے لگے کہ تم لوگ حاجی صاحب کے پاس

(۱) ''اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب وہ یہ کریں اور وہ صبر کرنیوالے ہیں جب کہ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں جب معاملہ کریں'' بقرہ: ۱۷۷ (۲) جنون تھا (۳) ''(بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور بہت سے گمانوں سے بچا کرو'' سورۃ الحجرات: ۱۲۔

دوڑ دوڑ کر کیوں جاتے ہو وہ تو کچھ زیادہ پڑھے ہوئے بھی نہیں۔ حضرت نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا میں نے کہا کہ تم کو کیسے سمجھاؤں کہ حضرت کے پاس کیا چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو وہ یہ کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کو مٹھائیوں کے نام خوب یاد ہیں مگر اس کے پاس کھانے کو کوئی مٹھائی بھی نہیں اور ایک وہ شخص ہے جس کے پاس قسم قسم کی مٹھائیاں موجود ہیں مگر اس کو نام معلوم نہیں اب تم بتلاؤ ان میں سے کون کس کا محتاج ہے۔ یقیناً جس کے پاس مٹھائیاں رکھی ہوئی ہیں اس کو نام یاد کرنے کی کچھ ضرورت نہیں اس کو ہر مٹھائی کی لذت حاصل ہے اور وہ مزے لے کر ہر اک کو کھا رہا ہے۔ البتہ جس کو محض نام یاد ہے وہ اسکا محتاج ہے کیونکہ محض نام یاد کرنے سے اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا نہ کچھ لذت آسکتی ہے۔ میں جب ڈھاکہ گیا تو نواب ڈھاکہ اپنی بیویوں سے قسم قسم کے کھانے پکوا کر میرے واسطے خود لایا کرتے تھے اور سامنے رکھ کر مجھ سے پوچھتے کہ بتلایئے کہ اس کھانے کے کیا اجزاء ہیں میں کہہ دیتا کھانے کی اجازت اس بتلانے پر موقوف ہے تو مجھ کو کھانے ہی کی ضرورت نہیں اور اگر موقوف نہیں تو پھر بتلانے کی ضرورت نہیں جب کہ اصل چیز میرے پاس آ چکی۔ نواب صاحب ہنستے اور ہر کھانے کا نام اور اجزاء بتلاتے۔ بے چارے بڑے بے نفس تھے کہ نواب ہو کر خود اپنے ہاتھ سے کھانا لاتے اور یہ بھی ان کی محبت تھی کہ اپنی بیگمات سے خاص طور پر میرے واسطے کھانے پکواتے تھے۔ غرض اہل ظاہر کی اہل اللہ کے سامنے وہ مثال ہے کہ کسی کو مٹھائی کے نام تو یاد ہوں مگر آنکھ سے کبھی نہ دیکھی ہوں اور اہل اللہ کو نام تو یاد نہیں مگر حقیقت ان کے پاس موجود ہے اس لئے وہ ہمارے محتاج نہیں اور ہم ان کے محتاج ہیں۔

علت کی تلاش کا موقع

اب سمجھئے کہ اہل اللہ نے اَجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ (۱) کی حقیقت کو سمجھا ہے اور ہم نے محض الفاظ پڑھے ہیں کیونکہ انہوں نے اس کی علت (۲) تلاش کی اور گو بلا ضرورت علل کا تلاش کرنا جائز نہیں مگر مجتہدین کو تعدیہ احکام کے لئے تتبع علل جائز

(۱) ''اور بہت سے گمانوں سے بچا کرو'' الحجرات: ۱۲ (۲) اس حکم کی وجہ۔

ہے(۱) اور مشائخ محققین بھی مجتہد ہوتے ہیں ان کو علت تلاش کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ انہوں نے اصلاح خلق کا(۲) بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے طریق اصلاح کو مدون کرنا ضروری تھا تو انہوں نے سمجھا کہ حرمت ظن کی علت تحقیر ہے(۳) کہ کسی کو حقیر سمجھ کر اس کے ساتھ بدگمانی نہ کرو اور اگر تحقیر نہ ہو بلکہ اصلاح مثلاً طبیب نبض دیکھ کر مریض سے یہ کہے کہ تم عنین (۴) ہو اور شاید تم نے فلاں حرکت کی ہے یا یہ کہ تم کو سوزاک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ناجائز افعال کے مرتکب ہو تو یہ بدظنی (۵) جائز ہے کیونکہ اس کا منشا تحقیر نہیں بلکہ طریق علاج کو معین کرنا مقصود ہے۔ اب اگر بیمار انکار بھی کرے تب بھی طبیب احتیاطاً اسی مرض کا علاج کرتا ہے جو اس نے سمجھا ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ ظن حرام (۶) ہے؟ ہرگز نہیں پھر مشائخ کا ظن حرام کیوں ہے وہ بھی اصلاح و معالجہ ہی کی غرض سے ظن کرتے ہیں، رہی تحقیر سو بخدا محقق تو کتے کو بھی اپنے سے بدتر نہیں سمجھتا۔ مسلمان کو تو وہ کیونکر حقیر سمجھے گا کہ وہ دھمکاتے بھی ہیں۔ کبھی تعلیم و تادیب کی غرض سے سزا بھی دیتے ہیں مگر ان کی اس وقت یہ حالت ہوتی ہے جو حالت اس بھنگی کی ہوتی ہے جسے بادشاہ نے حکم دیا ہو کہ شہزادے کے سو بید لگائے (۷) یقیناً حکم شاہی کی وجہ سے وہ شہزادے کے بید لگائے گا مگر اپنی فضیلت اور شہزادے کی مفضولیت کا اسے وسوسہ بھی نہ گزرے گا بلکہ بید لگاتے ہوئے بھی وہ شہزادے ہی کو افضل سمجھے گا اور بے حد شرمندہ ہوگا بتلایئے جس شخص کی حالت ظن کے وقت میں یہ ہو اُس کا ظن حرام ہوسکتا ہے؟ کبھی نہیں یہ تو اِنَّ بَعۡضَ ٱلظَّنِّ إِثۡمٌ (۸) سے استدلال کا جواب تھا۔

شیخ کا مرید سے ارتکاب گناہ کے بارے میں سوال کرنا

اب ایک شکال اور باقی رہا کہ بعض دفعہ مشائخ طالبین سے واقعات پوچھتے

(۱) دوسری جگہ وہ حکم لگانے کے لیے علت کا معلوم کرنا ضروری ہے تاکہ جہاں علت پائی جائے حکم لگایا جائے
(۲) مخلوق کی اصلاح کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے (۳) بدظنی کے منع ہونے کی علت دوسرے کو حقیر سمجھنا ہے
(۴) نامرد ہو (۵) بدگمانی (۶) کیا یہ گمان کرنا حرام ہے (۷) سو قمچیاں مارو (۸) بیشک بعض گمان گناہ ہے۔

ہیں کہ بتلاؤ تم نے کیا کیا گناہ کئے ہیں۔ علماء قشر[۱] کہتے ہیں کہ یہ گناہوں کا افشاء[۲] ہے اور افشاء معصیت[۳] حرام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بلاضرورت حرام ہے اور ضرورت سے جائز ہے جیسے ستر کا کھولنا بلاضرورت حرام ہے اور طبیب کے سامنے بضرورت[۴] کھولنا جائز ہے اسی طرح طبیب کو واقعات پوچھنا بھی جائز ہے۔ مثلاً وہ مریض سے یہ سوال کرے کہ تم اپنی بیوی پر کبھی قادر بھی ہوئے یا نہیں[۵] اور قادر ہوئے تو کس طرح ہوئے ہو رغبت سے یا بہ تکلف تصور کر کے اور طبیعت کو برانگیختہ[۶] کر کے وعلیٰ ہذا القیاس تو یہ افشاء راز نہیں بلکہ ضرورت کا سوال ہے جس کے بغیر طبیب معالجہ نہیں کر سکتا اس طرح مشائخ طالب کا کچا چٹا[۷] دریافت کرتے ہیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص میں کون کون سے مادے غالب ہیں تاکہ ان کا اول علاج کیا جائے میں بھی اس اعتراض سے مدت تک چکر میں رہا مگر پھر بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوا کہ بضرورت تتبع عورات جائز ہے[۸]۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ افک میں نزول وحی سے پہلے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: اما بعد یا عائشۃ انہ بلغنی عنك كذا وكذا فان كنت برئيته فسيبرئك الله وان كنت الممت يذنب فاستغفرى الله وتوبى اليه فان العبد اذا اعترف ثم تاب تاب الله عليه[۹]۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں واقعہ کو نقل کر کے اس کے صدور و عدم صدور کی تحقیق فرمائی اور دونوں شقوں کا حکم ظاہر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کو واقعات دریافت کرنا جائز ہے یہ تو اعتراضات کا جواب تھا۔

---

(۱) علمائے ظاہر کہتے ہیں (۲) گناہ کو ظاہر کرنا ہے (۳) گناہ کا اظہار کرنا حرام ہے (۴) ضرورت علاج کی وجہ سے جائز ہے (۵) بیوی سے جماع بھی کیا ہے یا نہیں (۶) زبردستی ابھار کر (۷) سب حال پوچھتے ہیں (۸) ضرورت کے وقت پوشیدہ باتوں کی تحقیق جائز ہے (۹) ''اے عائشہؓ مجھ کو ایسی ایسی خبر پہنچی ہے اگر تم بَری ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور تمہاری برأت ظاہر کریں گے اور اگر تم سے کچھ گناہ ہو گیا تو استغفار و توبہ کرلو، کیونکہ بندہ جب اعتراف گناہ کا کرے پھر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں'' بخاری ۳:۲۳۰ حدیث الافک۔

امراض قلبی کی پہچان

رہا یہ سوال کہ امراض قلب تو مخفی ہوتے ہیں [1] ان کا علم مشائخ کو کیونکر ہوتا ہے کیا ان پر وحی نازل ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں وحی تو نازل نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ تو اشارات وکنایات سے باطن کا حال معلوم ہوجاتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن میں باہم بہت تعلق ہے اور کبھی فراست سے صورت دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص فلاں گناہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عثمانؓ کا واقعہ ہے کہ ان کی مجلس میں ایک شخص نظر بد کر کے حاضر ہوا تو آپ نے مجملاً سب کو فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے ہمارے پاس ایسی حالت میں آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ یہ فراست کاملہ تھی اور اہل اللہ کو اس کا بڑا حصہ عطا ہوتا ہے۔ حدیث میں بھی وارد ہے: اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور اللّٰه [2] غالباً حضرت شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ ایک شخص ہمارے زمانہ میں ایسا صاحب فراست ہے کہ صرف صورت دیکھ کر آدمی کا نام بتلا دیتا ہے کیونکہ صورت میں اور نام میں خاص تناسب ہوتا ہے جس کو صاحب فراست صحیحہ دریافت کر سکتا ہے مگر ایسی اعلیٰ فراست واقعی قابل حیرت ہے۔

حضرت تھانویؒ کی فراست

باقی گفتگو اور تحریر سے اندرونی امراض کا حال معلوم کر لینا یہ تو اب بھی بہت سوں کو حاصل ہے۔ گو میں مشائخ میں سے نہیں ہوں مگر الحمد للہ مشائخ کا معتقد ہوں ان کی برکت سے مجھے بھی حق تعالیٰ نے ایسی فہم عطا فرمائی ہے کہ طرز گفتگو سے مجھے انداز طبیعت معلوم ہوجاتا ہے اور ایسا بین طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ میں یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یقین کا درجہ ہوتا ہے درجہ تو ظن ہی کا ہوتا ہے مگر ظن مرجوح نہیں بلکہ ظن غالب۔ ابھی چند روز ہوئے ایک شخص نے مجھے خط لکھا جس میں بیٹے کے بھو کے مرنے پر اس عنوان سے صدمہ ظاہر کیا تھا کہ ایک سترہ سالہ نوخیز نوجوان کی موت کا بہت بڑا صدمہ ہے۔

---

(۱) دل کا مرض تو پوشیدہ ہوتا ہے (۲) ''مؤمن کی فراست سے ڈرو بے شک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''سنن الترمذی: ۳۱۲۷۔

میں سترہ سالہ نو خیز کے لفظ سے سمجھ گیا کہ اس شخص کو اپنی بہو سے نفسانی محبت ہے۔ میں نے جواب میں اس کو متنبہ کیا کہ تم توبہ کرو۔ تم کو اپنی بہو سے ناجائز محبت ہے اب چاہے کوئی اس کو بدگمانی کہے مگر مجھے تو اس لفظ سے یہ مرض ایسا کھلا ہوا معلوم ہوا کہ جیسے طبیب کو قارورہ(۱) سے بخار۔ چنانچہ اس شخص نے جواب میں اس کا انکار نہیں کیا اور بحمد اللہ میں نے تجربہ کیا ہے کہ امراض باطنہ کے متعلق میری سو تجویزوں میں سے اگر سو پوری نہیں تو ننانوے تو ضرور صحیح ہوئی ہیں جن میں سے اکثر کا اقرار تو خود مریض نے کیا اور بعض کا ثبوت واقعات سے ہو گیا، البتہ ایسا ادراک بدون دلیل شرعی کے حجت نہیں۔

مرض بخل یا حسن انتظام

چنانچہ ایک مرض کی طرف اس وقت متوجہ کرتا ہوں اور وہ مرض بخل کا ہے جو ہم طالب علموں کے طبقہ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ہم لوگوں میں پوری سخاوت نہیں ہے حتیٰ کہ عوام میں مشہور ہو گیا کہ علماء کنجوس بہت ہوتے ہیں۔ گو اس دعوے کی دلیل میں وہ بعض ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جن کا منشاء بخل نہیں بلکہ انتظام ہے۔ مثلاً بعض لوگوں کو علماء کے اس فعل پر اعتراض ہے کہ یہ لفافوں کو الٹ کر دوبارہ کام میں لے آتے ہیں۔ میں ایسا بہت کرتا ہوں اور میں نے یہ طریقہ حضرت استاد سے سیکھا ہے۔ مولانا کی عادت تھی کہ لفافوں کو الٹ کر دوبارہ کام میں لے آتے تھے۔ اسی وقت سے مجھے بھی اس کی عادت ہے۔ سو یہ اعتراض تو لغو ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسے کام میں انگریزوں کی تو تعریف کی جائے اور مولویوں کو الزام دیا جائے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ یہ جو کاغذ بن کر آتا ہے اس میں حیض کے چیتھڑوں اور گوڈر کو کام میں لایا جاتا ہے۔ لکھنو میں کاغذ بننے کی مشین تھی۔ میں نے وہاں جا کر خود اس کا مشاہدہ کیا ہے اور اس پر لوگ تعریف کرتے ہیں کہ انگریز بڑے عاقل ہیں، کسی چیز کو ضائع نہیں کرتے۔ ہر چیز کو خواہ کیسی ہی بے کار ہو کام میں لے آتے ہیں۔ نیز ہم نے سنا ہے کہ ولایت میں درختوں کی چھال سے بھی کاغذ بنتا ہے جو ہمارے یہاں بے کار شمار ہوتی ہے نیز ہمارے بھائی

(۱) حکیم پیشاب دیکھ کر بخار کی کیفیت معلوم کر لیتا ہے۔

ایک ریاست میں ملازم تھے۔ زمانہ جنگ میں کاغذ بہت گراں ہوگیا تھا تو انہوں نے ہم طالب علموں سے سیکھ کر یہی عمل شروع کیا کہ لفافوں کو الٹ کر دوبارہ کام میں لانے لگے اور الٹے ہوئے لفافے کلکٹر کو دکھائے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی بہت مدح لکھی کہ ہمارے منیجر نے ایک مفید طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے ہم بہت خوش ہوئے۔ سب اہل ریاست کو اس طریقہ پر عمل کرنا چاہئے۔ لیجئے اب تو انگریزوں کا بھی فتویٰ ہوگیا اب تو ان لوگوں کو جو انگریزوں کے معتقد ہیں مولویوں کے اس فعل پر اعتراض کا حق نہیں رہا تو یہ کنجوسی نہیں ہے بلکہ انتظام ہے کہ مال کو اضاعت سے بچانا ہے جب ایک لفافہ دو مرتبہ اس طرح کام دے سکتا ہے تو کیا وجہ کہ اس سے دوبارہ کام نہ لیا جاوے مگر دیکھنا یہ ہے کہ جو شخص لفافے اُلٹتا ہے وہ جیسا صرف میں منظم ہے[۱] ایسا آمد[۲] میں بھی منظم ہے تو اس کو یہ فعل مبارک ہے اور جو آمدنی میں حرام وحلال کی پروا نہیں کرتا محض صرف ہی میں منظم ہے تو واقعی طماع[۳] ہے۔

مستعمل ٹکٹ کا حکم

ایک واقعہ جس میں بعض لوگ طمع[۴] سے کام لیتے ہیں یہ ہے کہ بعض دفعہ لفافہ کا ٹکٹ مہر سے بچ جاتا ہے تو میں اس کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ایسے ٹکٹ دیکھ کر سب سے پہلا کام میرا یہ ہوتا ہے کہ اس ٹکٹ کو فوراً چاک کر دیتا ہوں مگر بعض لوگ ایسے ٹکٹوں کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ شرعاً جائز نہیں کیونکہ ٹکٹ اس اجرت کی رسید ہے جو ڈاک پہنچانے کے عوض میں ڈاک والوں کو دی گئی ہے اور جب خط پہنچ گیا تو انتفاع کامل[۵] ہو چکا اب ایک بار کی اجرت میں دوبارہ کام لینا حرام ہے مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے مگر عوام میں اور خواص میں اتنا فرق ہے کہ عوام گناہ کر کے اس کے جواز کی دلیل بیان نہیں کرتے اور خواص ایسا کریں گے تو اس کے ساتھ لان[۶] بھی لگائیں گے۔ بعض تو یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ حربی[۷] کا مال ہے

(۱) خرچ کرنے میں منتظم ہے (۲) کمانے بھی منتظم ہے (۳) لالچی (۴) لالچ (۵) پورا فائدہ اٹھا لیا ہے (۶) کیونکہ کہہ کر اس کی دلیل بھی بیان کریں گے (۷) کافر دشمنوں کا مال ہے۔

اور حربی کا مال بدون غدر (۱) کے جس طرح بھی حاصل ہو حلال ہے۔ سو اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ صورت مذکورہ میں غدر نہیں کیونکہ جب یہ معاملہ اجارہ کا ہے اور اجارہ ایک دفعہ کے لئے منعقد ہوا ہے تو دوبارہ اس سے کام لینا یقیناً غدر ہے۔

کافر حربی اور معاہد میں فرق

اور اگر پھر بھی حربی کا مال استیلاء (۲) سے آپ کو حلال ہو جاتا ہے اسی طرح اگر حربی آپ کے مال پر استیلاء کرے تو اس کے لئے بھی تو آپ کا مال جائز ہو جاتا ہے کیونکہ استیلاء ان کے حق میں بھی سبب ملک سے ہے اب بتلاؤ اگر وہ تمہارا گھر لوٹ لیں تو ان کو بھی اس کا حق ہونا چاہئے پھر اس وقت چیختے کیوں ہو اور شکایت کس لئے کرتے ہو اگر ان کو یہ حق حاصل نہیں تو معلوم ہوا وہ صرف حربی نہیں بلکہ معاہد ہیں اور جب معاہد کیساتھ عام حربیوں (۳) کا سا معاملہ کرنا آپ کو کہاں جائز ہے بعض لوگ ریل میں بلا کرائے کے سفر کرتے ہیں اور یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ حربی کے مال سے انتفاع جائز ہے پھر بعض تو کہتے ہیں کہ معاہدہ ہوا ہی نہیں اور بعض کہتے ہیں ہوا تھا مگر ٹوٹ گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عہد ٹوٹ گیا ہے تو اگر وہ بھی آپ پر ظلم کریں تو ان کو حق ہونا چاہئے پھر اس وقت کیوں احتجاج کرتے ہو اور ان کو معاہدے کیوں یا دلاتے ہو یہ کیا جب تم کچھ کرو اس وقت تو عہد نہیں اور جب وہ کچھ کریں تو عہد ہو جاتا ہے جیسے بمبئی کے سیٹھ کرتے ہیں کہ ان کو سود سے منع کیا جائے تو یوں کہتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں سود جائز ہے اور جب زکوٰۃ کے لئے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہمارا مال تو سودی ہے اور حرام مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ سود لینے کے وقت تو وہ حلال تھا اور زکوٰۃ دینے کے وقت حرام ہو گیا۔ ان کی مثال شتر مرغ جیسی ہے کہ اس سے اڑنے کو کہا جائے تو کہتا ہے کہ اونٹ ہوں اور کہیں اونٹ بھی اڑا کرتا ہے اور جو کہا جائے کہ پھر بوجھ اٹھا تو کہتا ہے میں تو پرندہ ہوں اور پرندہ بھی کہیں بوجھ لادا کرتا ہے۔ حضرت عطار فرماتے ہیں:

(۱) بلا دھوکہ (۲) تسلط (۳) حربی وہ کافر کہلاتے ہیں جن سے جنگ ہو رہی ہو۔

چوں شتر مرغِ شناس این نفس را نے کشد بارد نہ پرد بر ہوا
گر پر گوئیش گوید اشترم ور نہی بارش بگوید طائرم(۱)

یہ تو بیباک لوگوں کا حال تھا اور جو محتاط ہیں وہ یہ کہہ کر مستعمل ٹکٹوں کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہم سے بعض ناجائز حقوق وصول کرتی ہے جیسے انکم ٹیکس وغیرہ۔ ہم اس کا عوض اس طرح وصول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اول تو فقہاء سے استفسار کرو کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز بھی ہے یا نہیں کیونکہ گورنمنٹ تم سے نقد لیتی ہے اور تم منفعت سے عوض لیتے ہو اور اس کے حل کرنے کے بعد اگر جواز کی گنجائش ہے تو اسی شخص کو ہے جس سے گورنمنٹ ایسے حقوق وصول کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ سب پر انکم ٹیکس وغیرہ کہاں پھر آپ کے پاس اس کا حساب بھی محفوظ ہے کہ گورنمنٹ نے تم سے کتنا وصول کیا اور تم کتنا وصول کر رہے ہو۔ بس معلوم ہوا کہ یہ بھی محض بہانہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے واسطے وصول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں پھر کیا تم نے کبھی ان دوسروں کو ان کے یہ حقوق پہنچائے ہیں۔ یعنی جتنا انگریزوں سے وصول کیا ہو ان اہل حقوق کو حوالہ کر دیا ہو کہ ہم نے تمہارے یہ حقوق انگریزوں سے لئے ہیں تم لو اور اہل حقوق کے معلوم نہ ہونے پر اس کو فقراء میں صدقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی نہیں کرتا پھر یہ سب مراحل طے کرنے کے بعد شیخ طریقت کا فتویٰ باقی ہے۔ اگر علماء کے فتوے سے یہ فعل جائز بھی ہو جائے تب بھی شیخ اس سے منع کر سکتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اس کی نبض دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستعمل ٹکٹوں کو استعمال کر کے یہ شخص اپنی حد پر نہ رہے گا اور اس میں مرض طمع بڑھ جائے گا اس لئے اس کو یہ فعل جائز نہیں۔

ذلت سے بچاؤ

دوسری حدیث میں ہے لا ينبغي للمؤمن ان يذل نفسه (۲) یعنی مسلمان کو

---

(۱) ”اپنے نفس کو شتر مرغ کی مانند (چالاک) سمجھو کہ جو تو نہ بوجھ اٹھاتا ہے اور نہ ہوا میں اڑتا ہے لہٰذا اگر اس سے کہا جائے کہ اڑ تو کہتا ہے میں تو اونٹ ہوں اور اگر کہا جائے کہ بوجھ اٹھا تو کہتا ہے کہ میں تو پرندہ ہوں“

(۲) مشکوۃ المصابیح: ۲۵۰۳

نہ چاہئے کہ اپنے کو ذلیل کرے اور مستعمل ٹکٹ لگانے میں ذلت کا اندیشہ ہے،خواہ کیسے ہی صاف ہوں مگر بعض دفعہ ڈاکخانہ والے خورد بین سے اسے دیکھتے ہیں اور مہر کا خفیف سا(۱) اثر ان کو نظر آ جاتا ہے جو ہم کو نظر نہیں آیا تھا، پھر اس میں بعض دفعہ جیل خانہ ہو جاتا ہے تو چار پانچ پیسوں کے لئے اپنے کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہے۔ اگر ایسا ہی لگانا ہے تو پوسٹ ماسٹر کو اطلاع کر کے لگاؤ دیکھو تو کیسی خبر لی جاتی ہے۔ اسی واسطے بعض علماء کہتے ہیں کہ چونگی دے دیا کرو تا کہ بعد میں ذلت نہ ہو۔ نیز بعض دفعہ اس میں اسلام کی ذلت ہوتی ہے کیونکہ عرفاریل میں بے ٹکٹ سفر کرنا اور استعمالی ٹکٹوں کو دوبارہ کام میں لانا اور چونگی سے مال کو بچا لینا بے ایمانی شمار ہوتا ہے اب اگر کبھی گرفت ہوگئی اور واقعہ کھل گیا اور تم سے عدالت میں سوال ہوا کہ تم نے یہ جرم کیوں کیا اور آپ نے یہ جواب دیا کہ میرے مذہب میں ایسا کرنا جائز تھا جیسا کہ بریلی میں ایک تاجر نے برسر عدالت یہی جواب دیا تھا تو عدالت والے یہ کہیں گے کہ تو بہ توبہ اسلام بے ایمانی اور چوری سکھلاتا ہے اس لئے مشائخ کہتے ہیں کہ اسلام کو ذلت سے بچانے کے لئے چونگی دے دو اور چار پیسوں کی بچت نہ کرو۔ یہ وہ مفاسد ہیں جن پر علماء قشر (۲) کی نظریں نہیں پہنچتیں، ان کو مشائخ عارفین ہی سمجھتے ہیں۔

آج کل مشائخ

مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل مشائخ ہی کم ہیں ہاں چوبیس ہزار اسم ذات بتلانے والے بہت ہیں لیکن اصلاح کرنے والے اور اخلاق رذیلہ (۳) کا معالجہ کرنے والے بہت کم ہیں کیونکہ اس میں عوام میں بدنامی ہوتی ہے لوگ ایسے مصلح کو بداخلاق اور تنگ مزاج کہتے ہیں تو خواہ مخواہ بدنامی اپنے سر کون لے۔ ارے میں کہتا ہوں کہ پھر اس کی ہی کیا ضرورت ہے کہ لوگ آپ کو اچھا کہیں اور تمہارا تو یہ مزاج ہونا چاہئے۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان   مانمی خواہیم ننگ و نام را(۴)

(۱) ہلکا سا اثر (۲) ظاہری علماء (۳) برے اخلاق کا علاج کرنے والے (۴) اگر چہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بد نامی ہے لیکن ہم بدنامی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے"۔

میں اس میں ننگو کو منادی بھی کہا کرتا ہوں اگر چہ رسم خط موافق نہیں مگر پڑھنے میں تو آتا ہے یعنی اے ننگو(۱) جو معرفت سے عاری ہو(۲) ہم کو نام کی ضرورت نہیں اردو میں کسی نے اس مضمون کو دوسری طرح کہا ہے:

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا(۳) اور جو خود نا کام ہو اس کو کسی سے کام کیا

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے (یعنی طریق اصلاح اختیار کرنے سے) معتقد کم ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ خیال غلط ہے گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے اور مان لو معتقد کم بھی ہوئے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں کام پر بھیجو گے اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام کے نہ ہوئے تو ان کو لے کر کیا کرو گے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد تھوڑے ہوں اور کام کے ہوں اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ ہجوم خلق(۴) زیادہ نہ ہوگا کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل(۵) پڑتا ہے یہ جواب تو بطور ارخاء عنان(۶) کے ہے۔

حضرت تھانویؒ کا مذاق

ورنہ میرا اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو گونگے اعتقاد سے وحشت(۷) ہوتی ہے مگر جسے ہجوم خلائق سے محبت ہو جو ہر وقت اپنے گرد مجمع چاہتا ہے وہ تو بے شک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور طریق اصلاح کو اختیار نہ کرے گا۔ میں تو حق تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ الحمد للہ میری پیدائش میں ایک مجذوب(۸) کی نظر و توجہ کو دخل ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھے بچپن ہی سے ہجوم سے نفرت ہے۔ زمانہ قیام کانپور میں یہ حالت تھی کہ میں تنہا گلی کوچوں میں پھرتا تھا اور ہجوم سے گھبراتا تھا گو اس تنہا گردی(۹) سے بعض

---

(۱) اے بے لباس لوگو (۲) جن کو معرفت کی کچھ خبر نہیں (۳) بدنام عاشق کو بدنامی کی کیا پروا (۴) لوگوں کا ہجوم (۵) خرابی واقع ہوتی ہے (۶) لگام ڈھیلی چھوڑنے کی صورت میں ہے (۷) گھبراہٹ (۸) ایک مجذوب نے حضرت تھانویؒ کی پیدائش کے لیے دعاء کی تھی اور حضرت کے والد صاحب سے کہا تھا تمہارے دو بیٹے ہوں گے ایک میرا ہوگا اس کا نام اشرف علی رکھنا (۹) اکیلے پھرنے سے۔

اوقات کچھ پریشانی بھی ہوجاتی تھی۔ چنانچہ ایک بار مدرسہ جامع العلوم کا جلسہ ہوا تو جلسہ کے لئے ایک بڑا مکان تجویز کیا گیا جو طلاق محل (۱) کے نام سے مشہور تھا وجہ تسمیہ (۲) یہ تھی کہ اس محل میں ایک نواب کی بیگم طلاق لے کر رہتی تھی۔ جب میں نے جلسہ کا اشتہار شائع کیا اور جلسہ کا اس مکان میں ہونا ظاہر کیا تو اس کا نام طلاق محل کے تلاق محل تاء (۳) سے شائع کیا لفظ طلاق کو میں نے جلسے کے لئے مناسب نہ سمجھا (۴)۔ لوگ اس تصرف (۵) سے بہت خوش ہوئے کہ مکان کا نام بھی نہ بدلا اور فال بد سے بھی حفاظت ہوگئی تو جس زمانہ میں جلسہ کا اشتہار شائع کیا گیا تھا اس وقت بعض انتظامات کے لئے مجھے اس مکان میں جانا پڑا تھا۔ ایک دفعہ میں تنہا جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا کیونکہ یہ مکان مدرسہ کے زیادہ قریب نہ تھا۔ اب مجھے کسی سے پوچھتے ہوئے بھی شرم آتی تھی کہ تلاق محل کا راستہ کدھر کو ہے۔ یہ خیال ہوا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ انہی کے مدرسہ کا تو جلسہ ہے اور یہی اشتہار شائع کر رہے ہیں اور خود راستہ بھی نہیں جانتے۔ غرض دشواری سے راستہ ملا اور یہ خمیازہ تھا تنہا گردی (۶) کا مگر پھر بھی بچپن ہی سے میری یہی حالت ہے۔ اسی کا اثر اب بھی ہے کہ مجھے ہجوم سے نفرت ہے۔

بیعت کرنے میں حضرت تھانوی کا معمول

اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنا چاہئے بلکہ جہاں تک ہوسکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کر کے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے ورنہ تو وابستہ ہوکر طریق سے بے کار اور پابستہ ہوجائے گا کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ یہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہوگا یا نہیں اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتداء ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی، پھر وہ عمل کا اہتمام

(۱) جدائی کا محل (۲) اس نام کے مشہور ہونے کی وجہ (۳) ملاقات کا محل (۴) کہ جلسہ لوگوں کی جدائی کے مقام پر منعقد نہ ہو بلکہ ملاقات کے محل میں منعقد ہو (۵) اس تبدیلی سے (۶) یہ نتیجہ تھا اکیلے پھرنے کا۔

کرے گا اور بار بار روک ٹوک کرنے سے اس میں ترقی ہوگی اگر وہ روک ٹوک کا تحمل کرتا رہا تو ان شاء اللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہوجائے گا اور بدوں اس کے تو فضول بھرتی کرنا ہے۔

اخلاق باطنہ کی غرض

غرض اخلاق باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں چونکہ اس سے علماء تک بھی غافل ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ شرائطِ کمال میں ان کو بھی داخل فرمایا۔ چنانچہ اول وَٱلۡمُوفُونَ بِعَهۡدِهِمۡ إِذَا عَٰهَدُواْۖ (۱) فرمایا اور اس سے آگے ارشاد فرمایا: وَٱلصَّٰبِرِينَ فِي ٱلۡبَأۡسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلۡبَأۡسِ (۲) یہی جزو اس وقت مقصود بالبیان ہے اور جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس کو اسی جزو سے تعلق ہے۔

مقصد وعظ

اول میں مقصود کی تعیین کرتا ہوں اس کے بعد آیت سے اس کا ارتباط (۳) بیان کروں گا۔ اس وقت مجھے دو چیزوں کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے۔ شاید آپ یہ سمجھے ہوں کہ ایک رمضان ہوگا اور ایک عید۔ نہیں صاحب ایک عید ہے اور ایک وعید ہے عید تو رمضان ہے شاید یہ کہو یہ کیسی عید ہے سو سن لیجئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاورہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کو عید فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے شهرا عيدٍ لا ينقصان (الصحيح المسلم كتاب الصيام: ۳۱) کہ دو مہینے عید کے کم نہیں ہوتے آپ تو عید کا مہینہ شوال کو سمجھتے ہوں گے اور ذی الحجہ کو مگر نہیں حدیث میں اس کی تفسیر ذوالحجہ و رمضان وارد ہے اور ان کا ناقص نہ ہونا بایں معنی (۴) ہے کہ نقصان ایام ثواب کم نہیں ہوتا (۵)۔ مثلاً رمضان ۲۹ دن کا ہو تو ثواب پورے تیس دن کا ملے گا اور ذوالحجہ میں بھی اختلاف ہلال (۶) سے نقصان ایام محتمل تھا (۷) کیونکہ ذوالحجہ میں نو روزے

---

(۱) ''اور وہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب وہ عہد کریں'' سورۃ البقرہ: ۱۷۷ (۲) ''اور صبر کرنیوالے ہیں سختی اور تکلیف میں اور جنگ کے وقت'' سورۃ البقرہ: ۱۷۷ (۳) آیت پر اس کو منطبق کروں گا (۴) اس اعتبار سے ہے (۵) دنوں کی کمی سے ثواب میں کمی نہیں ہوتی (۶) مختلف تاریخوں میں چاند کے طلوع کی وجہ سے (۷) نقصان کا احتمال تھا۔

ہیں یکم سے عرفہ کے دن تک تو اگر کبھی تاریخ کے اختلاف سے یہ صورت ہو کہ جس دن کو ہم نے عرفہ سمجھا تھا وہ شہادت سے یوم النحر (۱) ثابت ہوا اور اس دن کا روزہ نہ رکھ سکے تو روزہ رکھنے والوں کو پورے نو دن کے روزوں کا ثواب ملے گا، گو ظاہر میں آٹھ ہی روزے ہوئے۔ اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ ذوالحجہ کا شہر عید ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ عید اس ماہ میں واقع ہوئی ہے لیکن رمضان کو کس اعتبار سے شہر عید کہا گیا کیونکہ عید الفطر تو ختم رمضان کے بعد آئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رمضان کو مقدمہ عید ہونے کی وجہ سے شہر عید کہا گیا اور مقدمہ اس لئے ہے کہ عید کا لطف رمضان ہی سے آتا ہے، جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ہوں اسی کو عید کے دن کھانے پینے کا لطف ہے ظاہراً بھی اور باطناً بھی اور جس نے روزے رکھے نہ ہوں اس کی کیا عید اس کے لئے تو یہ دن اور باقی سب یکساں ہیں۔ یہ تو ظاہری بے لطفی ہے اور باطن میں اس طرح کہ روزے رکھنے کی وجہ سے اس کا دل عید کے دن منشرح (۲) نہ ہوگا بلکہ معصیت (۳) کی وجہ سے بے چین ہوگا اور یہ دن معلوم ہوگا جیسے پھٹکار برس رہی ہو۔ قال الشاعر

خوشی کے ترانے خبر دے رہے ہیں　　سحر جلوہ بخش جہاں عید ہوگی
مگر جن کے دل مر چکے ہیں انہیں کیا　　جہاں عید ہو گی وہاں عید ہوگی

مسلمانوں کو بشارت

یہاں سے ایک لطیفہ سمجھ میں آیا جو بطور بشارت ہے کے سناتا ہوں وہ یہ کہ میں نے شوقِ وطن میں دعویٰ کیا کہ موت مسلمانوں کے لئے بہر حال رغبت کی چیز ہے، عید ہے اگر چہ مسلمان جہنم میں بھی جائے جیسے رمضان عید ہے اگر چہ اس میں فاقہ ہی ہو یعنی جیسے رمضان اس لئے عید ہے کہ عید کا لطف اسی سے ہے اسی طرح بعضے مسلمانوں کے لئے جہنم سے جنت کا لطف بڑھ جاوے گا۔ جیسا بعض کو بلا واسطہ بھی جنت کا لطف

(۱) بقر عید کا دن مطلب ہے کہ چاند ایک دن پہلے طلوع ہو چکا تھا اعلان بعد میں ہوا بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ یکم ذی الحجہ تو ایک دن قبل تھی اس نو ذی الحجہ کو اصل میں دس ہے اور اس دن روزہ رکھنا حرام ہے (۲) اس کے دل میں انشراح وخوشی حقیقی نہ ہوگی (۳) روزہ نہ رکھنے کے گناہ کی وجہ سے۔

بھی حاصل ہوگا، البتہ جہنم جیسے اثر کے اعتبار سے لطف افزا [۱] ہے۔ ذات کے اعتبار سے مثل گرم حمام کے ہے جہاں گرم گرم پانی سے غسل دیا جاتا ہے تکلیف وہ بھی ہے لیکن اس تکلیف کا انجام تصفیہ وتزکیہ [۲] ہے اسی لئے کفار کے حق میں لا یزکیھم (نہیں پاک کرے گا) فرمایا گیا ہے اور مومنین کے باب میں عقوبت کے بعد حتی اذاھذبوا و نقوا [۳] آیا ہے مگر گرم پانی کا بھی تحمل مشکل ہے تو بندہ میلا ہو کر ہی کیوں جاوے کہ حمام سے غسل دیا جائے جس کی برداشت نہ ہو سکے اور اس لئے وہ مصیبت نظر آوے۔

چمار کی حکایت

جیسے ایک چمار [۴] کے لڑکے کا قصہ ہے کہ وہ بگولے [۵] میں لپٹ کر اڑ گیا تھا اور ایک راجہ کے محل پر جا پڑا۔ لوگوں نے جو اس کو آسمان سے گرتا ہوا دیکھا، یوں سمجھے کہ یہ کوئی اوتار ہے [۶]۔ فوراً اس لڑکے کو تعظیم وتکریم کے ساتھ راجہ کے پاس لائے ۔ راجہ نے وزیر سے مشورہ کر کے یہ رائے طے کی کہ بادشاہ زادی کا نکاح اسی لڑکے سے کر دیا جائے کیونکہ اس سے بہتر کون ہوگا ۔ یہ تو ابھی خدا کے پاس سے آ رہا ہے لیکن چونکہ ظاہر میں خراب خستہ تھا اس لئے حکم دیا کہ اس کو حمام میں لے جا کر غسل دیا جائے وہاں جو اس کے بدن پر گرم گرم پانی پڑا تو چیخنے چلانے لگا اور یہ سمجھا کہ مجھے مجرم قرار دے کر یہ سزا دی جا رہی ہے۔ وہاں سے نکال کر اسے قیمتی پوشاک پہنائی گئی۔ اس سے اور زیادہ رویا، پھر بہلانے کے لئے اس کے سامنے جواہرات ڈالے گئے ۔ ان کو دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور رونا بند نہ ہوا، پھر شہزادی کو اس کے سامنے بھیج دیا گیا کہ شاید اس کو دیکھ کر مانوس ہو، اس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور پہلے سے زیادہ چلانے لگا۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ ابھی عالم غیب سے تازہ تازہ آیا ہے اس لئے دنیا سے وحشت کرتا ہے ۔ چند دن اس کے حال پر چھوڑ دیا جاوے تا کہ مانوس ہو جائے ۔ چنانچہ چھوڑ دیا گیا۔ چھوٹنے کے ساتھ ہی محل سے نکل کر بھاگا اور اپنی ماں کے

---

(۱) زیادہ لطف آئے گا (۲) صفائی اور پاکیزگی ہے (۳) ''انہیں پاک صاف کرے گا'' رواہ البخاری
(۴) جھاڑو پوچہ کرنے والا بھنگی (۵) آندھی کے بھنور میں پھنس کر (۶) خدا رسیدہ آدمی۔

پاس پہنچا اور اپنی سرگزشت اس طرح بیان کی کہ مجھے بہت سے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ میں جب بھی نہ مرا، پھر مجھے ایک جگہ لے گئے اور تتا تتا (۱) پانی میرے اوپر ڈالا (یعنی گرم گرم) میں جب بھی نہ مرا تو پھر مجھ کو کفن پہنایا (یہ پوشاک کی قدر کی) میں جب بھی نہ مرا، پھر میرے سامنے آگ کے انگارے رکھے (یہ جواہرات کی قدر کی) کہ شاید ان سے جل جائے۔ میں جب بھی نہ مرا، پھر ایک ڈائن کو جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھی (یہ شہزادی کی گت بنائی) میرے پاس بھیجا تا کہ مجھے کھالے میں جب بھی نہ مرا۔ اسی طرح اس نے سب باتوں کو مصیبت وعذاب ہی کے پیرایہ میں بیان کیا تو جس طرح اس چمار کے لڑکے نے حمام کے غسل کو عذاب سمجھا تھا اسی طرح ممکن ہے کوئی مسلم جہنم کو بھی اپنے لئے عذاب محض سمجھے ورنہ حقیقت میں وہ مسلمانوں کے لئے مثل حمام کے ہے تمہارے واسطے عذاب نہیں ہے۔

دوزخ میں مسلمانوں کا حال

عذاب تو کافروں کے لئے ہے اسی واسطے ارشاد ہے: **أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ** یعنی جہنم ہونے کی حیثیت سے تو کفار ہی کے لئے، مسلمانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کے لئے تو محض حمام ہے۔ گو گرم گرم پانی اور خادمان حمام کے ملنے ولنے (۲) سے تکلیف بھی ہوتی ہے مگر خدا کی قسم تم کو کفار کے برابر تکلیف نہ ہوگی، پھر مسلمانوں کو وہاں خدا تعالیٰ سے محبت زیادہ ہو جائے گی اس لئے بھی جہنم سے تکلیف زیادہ نہ ہوگی کیونکہ محبوب کے ہاتھ سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ تکلیف محض نہیں ہوتی اور گو حق تعالیٰ یہاں بھی محبوب ہیں مگر دنیا میں ہماری محبت ناقص ہے اس لئے بعض دفعہ کلفت (۳) دہ واقعات سے تکلیف ہوتی مگر ہے جیسے ایک شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! مجھے کھینچ، کسی مسخرہ نے سن لیا اور اس نے کہا کہ اس کو مزہ چکھانا چاہئے۔ چنانچہ اگلے دن ایک رسی ساتھ لے کر پہلے سے درخت پر جا بیٹھا۔ جب اس نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ، تو اس نے رسی میں پھانسی لگا کر اسے لٹکا دیا اور نرم آواز سے کہا میرے بندے

(۱) کھولتا ہوا پانی (۲) رگڑ رگڑ کر جسم ملنے سے (۳) پریشانی۔

اس رسی کو اپنے گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا۔ یہ بیوقوف بڑا خوش ہوا کہ دعا قبول ہوگئی اور سچ مچ اللہ میاں مجھ سے کلام فرما رہے ہیں۔ اس نے رسی کو گلے میں ڈال لیا۔ اس نے کھینچنا شروع کیا۔ جب زمین سے دو گز اٹھ گیا اور گلا گھٹنے لگا تو آپ کہتے ہیں کہ اے اللہ! میں نہیں کھنچتا، مجھے چھوڑ۔ خیر یہ حکایت تو مسخرہ پن کی ہے مگر ہماری حالت دنیا میں یہی ہے کہ ذرا سی تکلیف میں ساری محبت دھری رہ جاتی ہے مگر آخرت میں ایسا نہ ہوگا۔ وہاں محبت قوی ہوگی اس لئے مومن کو عذاب میں بھی مشاہدہ راحت کا ہوگا البتہ کفار کو خالص عذاب کے مشاہدہ سے آخرت میں حق تعالیٰ سے بغض بڑھ جائے گا۔

اجتماع عیدین

غرض یہ تو عید ہے یعنی رمضان جس کا بیان اس وقت ہوگا اور دوسری وعید ہے یعنی طاعون جس کو عام لوگ وعید[۱] سمجھتے ہیں اور خواص تو اس کو بھی عید کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو عید میں بھی واو عاطفہ ہے یعنی عید وعید[۲] گویا عیدین مجتمع ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ کیسی عید ہے۔ چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ رمضان جیسے اچھی موسم میں آئے تھے کہ رات بھی ٹھنڈی اور دن بھی ٹھنڈا اس سے بڑا لطف آتا مگر طاعون نے کام کھو دیا اور سارا لطف کرکرا[۳] ہو گیا اس کو تم عید کہہ رہے ہو۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ طاعون سے لطف دوبالا ہو گیا۔ یہ عجب رمضان ہے کہ رمضان بھی اور طاعون بھی ہے۔ دو نعمتیں جمع ہو رہی ہیں۔ شاید کوئی کہے کہ یہ کیسی نعمت ہے۔ میں کہتا ہوں واقعی نعمت ہے، کیونکہ سبب شہادت ہے اور اس میں نعمت کی صفت ایسی قوی ہے کہ جس شخص کو طاعون بھی نہ ہو مگر وہ طاعون کی جگہ پر صابراً محتسبًا قیام کرے[۴] اور یہ سمجھ کر ٹھہرا رہے کہ جو کچھ ہوگا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوگا، اس کے لئے بھی شہادت کا ثواب ہے گو تندرست[۵] ہی رہے۔

(۱) دھمکی (۲) عید اور عید یعنی دونوں عیدیں جب وعید کے واؤ کو عاطفہ کہا تو اس کے معنی اور کے ہو گئے (۳) بدمزہ (۴) صبر کے ساتھ ثواب کی امید پر طاعون کی جگہ ٹھہرا رہے (۵) اگرچہ صحت مند رہے۔

بستی طاعون سے باہر جانے کا حکم

اور جو شخص طاعون کی جگہ سے بھاگے اس کے لئے حدیث میں سخت وعید[۱] ہے۔ مگر بھاگنا یہ ہے کہ طاعون کی وجہ سے جائے۔ باقی کسی ضرورت سے جانا بھاگنا نہیں ہے۔ شریعت نے تنگی میں نہیں ڈالا کہ کوئی ضرورت بھی پیش آئے تب بھی طاعون کی جگہ سے باہر نہ جاؤ مگر اس کا ایک معیار ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص کسی ضرورت سے باہر جاتا ہے وہ یہ دیکھ لے کہ بستی میں طاعون نہ ہوتا تو کیا جب بھی باہر جاتا۔ اگر جب بھی باہر جاتا تو یہ فرار نہیں اور اگر اس وقت باہر نہ جاتا اور اب جا رہا ہے تو یہ فرار ہے اور ضرورت خدا تعالیٰ سے معاملہ ہے۔ اس کو ہر شخص اپنے دل میں خود ٹول لے۔

کار با او راست باید داشتن راست اخلاص صداق افراشتن
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کا رہا با خلق آرے جملہ راست با خدا تزویر وحیلہ کے رواست[۲]

اور اگر کوئی واقعی ضرورت سے جائے جس کا معیار ابھی بتلا چکا ہوں تو پھر اس کو بدنام کرنا بری بات ہے اور کوئی بدنام بھی کرے تو اس کو خدا کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھنا چاہئے اور کسی کے کچھ کہنے کی پروانہ کرنی چاہئے۔ لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ خواہ مخواہ بھی بدنام کیا کرتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ جھوٹ موٹ بھی بدنام کرتے ہیں۔

لوگوں کی بدگمانی

میری نسبت یہاں ایک محلّہ میں جس کا نام نہیں لیتا یہ مشہور ہوا کہ اپنی بہو کو جو طاعون میں مرگئی تھی دفن کر کے دو بوریاں غلہ کی اور پانچ روپیہ تقسیم کر کے بھاگ گیا (اور خدا کے فضل سے میری کوئی بہو ہی نہیں خیر یہ شہرت تو گو غلط تھی مگر اچھی ہوئی

(۱) دھمکی ہے (۲) ’’حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئے اخلاص اور سچائی کا علم بلند رکھنا چاہیئے۔ میں نے فرض کیا کہ تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر حق سبحانہ وتعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے‘‘۔

کہ دو بوریاں غلہ کی تقسیم کرنا بھی میری طرف منسوب کر دیا۔ بھلا مولویوں کو یہ بات کب نصیب ہوتی ہے کہ ان کی طرف یہ شہرت ہو۔ مولویوں کو تو عام لوگ کنجوس کہا کرتے ہیں، لیکن بھاگنے کی شہرت تو غلط بھی تھی اور بری بھی تھی۔ اب اس راوی کو چاہئے کہ اس وقت مجھے دیکھ کر یہ بھی کہہ دے کہ بھاگ کے آ بھی گئے، کیونکہ اب تو میں سامنے موجود ہوں۔ دراصل یہ واقعہ بھائی صاحب کا ہے۔ اپنی بہو کے مرنے کے بعد غلہ کی بوریاں اور پانچ روپے انہوں نے تقسیم کئے تھے اور اس کے بعد کسی ضرورت یا بے ضرورت (مجھ کو معلوم نہیں) وہ سہارن پور چلے گئے۔ اگر وہ بے ضرورت گئے تھے تو فرار تھا ورنہ نہیں۔ بلا تحقیق تو ان کو بھی کچھ نہ کہنا چاہئے تھا نہ کہ الٹا ان کی جگہ مجھے بدنام کرنا شروع کر دیا، حالانکہ میں کہیں بھی نہیں گیا۔ غرض دوسری عید یہ طاعون ہے جو شہادت ہونے کی وجہ سے نعمت ہے۔

نوٹ: اس وعظ کا بقیہ حصہ اگلے شمارے میں چھپے گا جس کی ابتدا اس عنوان سے ہو رہی ہے (ایک شبہ کا جواب)۔

أخبار الجامعة

ماہ اپریل/مئی 2024ء

الحمد للہ ماہ رمضان المبارک ایمان واعمالِ خیر کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کو نصیب ہوا، جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ کے حفاظ وقراء کرام نے اپنی اپنی جگہ نمازِ تراویح میں قرآن کریم سننے اور سنانے کی سعادت حاصل کی۔

❁ **25** ویں شب: جامعہ کی شاخ دارالفلاح مصطفیٰ ٹاؤن میں تکمیل قرآن کریم کے موقع پر مولانا قاری رشید احمد تھانوی صاحب (حفظہ اللہ تعالیٰ) اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے حاضرین سے خطاب فرمایا۔

❁ **27** ویں شب: مرکزی درس گاہ کامران بلاک کی مسجد میں تکمیل قرآن کریم کے موقع پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے عظمتِ قرآن کریم پر خصوصی وعظ فرما کر دُعا خیر فرمائی۔

تعلیمی رپورٹ 24۔2023ء

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ماہِ شوال سے جامعہ کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا ہے۔

گذشتہ سال دورۂ حدیث کے کل **52** طلباء نے تکمیل فرمائی اور ساتھ ساتھ عصری تعلیم میں **38** طلباء نے ایم اے، **13** طلباء نے بی اے، **1** نے ایم فل بھی کیا۔

اور وفاق المدارس کے تحت تجوید وقراءۃ کی تعلیم مکمل کرنے والے **152** طلباء میں سے **82** نے میٹرک سائنس سے مکمل کی۔

اور قراءاتِ سبعہ وثلٰثہ مع درس نظامی خاصہ وعالیہ کے **78** طلباء نے ایف اے مکمل کیا۔

❁ حضرت مولانا ڈاکٹر قاری خلیل احمد تھانوی (مدظلہ العالی) نائب مہتمم جامعہ ہٰذا اپنے بیٹے مولانا ابوذر تھانوی (سلّمہ) کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل کر کے بخیر وعافیت واپس پہنچ گئے۔

❁ **22** اپریل اتوار نئے تعلیمی سال کے آغاز پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی کی زیر سرپرستی دارالاہتمام میں اساتذہ کرام کے ساتھ مشاورتی اجلاس ہوا جس میں تعلیمی نظم کے حوالے سے مناسب اُمور متفقہ رائے سے طے ہوئے اجلاس کے اختتام پر سرپرست اعلیٰ مجلسِ شوریٰ حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور نے بذریعہ فون حضرت قاری احمد میاں تھانوی صاحب (مہتمم جامعہ) جامعہ کے احوال دریافت فرما کر دعا وسلام سے نوازا

❁ **28** اپریل بروز اتوار سے افتتاح بخاری شریف کے ساتھ نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ جامعہ ہٰذا کو مزید ترقیات سے نوازیں (آمین)